بسم الله الرحمن الرحیم

علمی - تحقیقی ششماہی مجلّہ

انجمن علمی قرآن اور حدیث (اردو)

ذکروفکر

سال دوئم شمارہ: ۲ ستمبر ۲۰۲۲ (صفر ۱۴۴۴)

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

پیشکش:شعبہ قرآن اور حدیث _ شعبہ تحقیق

سرپرست: ڈاکٹر سعید ارجمند فر

چیف ایڈیٹر: ڈاکٹر جابر محمدی

اڈیٹر: ڈاکٹر سید محمد علی عون نقوی

اجرائی مدیر: عون علی جاڑوی

خط وکتابت: قم، خیابان ساحلی جنوبی، نزد مصلی قدس، پل ۱۹ دی

پوسٹ کوڈ: ۳۷۱۳۹۱۳۵۵۴

ٹلیفون/فکس: ۳۲۱۱۴۱۸۵-۳۲۶۱۳۸۷۵

تعداد: الکٹرانک

تعداد صفحات: ۱۸۰

Web: *mou.ir/ur*

مجلس تحریر

علی محمد نقوی	رکن علمی بورڈ علیگڑھ یونیورسٹی (ہندوستان)
ماہرخ مرزا	چانسلر معین الدین چشتی یونیورسٹی (ہندوستان)
زاہد علی زاہدی	رکن علمی بورڈ کراچی یونیورسٹی (پاکستان)
سید محمد علی عون نقوی	رکن علمی بورڈ جامعۃ المصطفیٰ العالمیہ، (ہندوستان)
جابر محمدی	استاد المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی (پاکستان)
عون علی جاڑوی	استاد المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی (پاکستان)
ثروت رضوی	ISI علمی تحقیقی مجلّہ (پاکستان)

ڈپٹی ریسرچ جامعۃ المصطفیٰ العالمیہ

کی طرف سے

اس مجلّہ کی سطح، طلباء کی علمی انجمنوں سے مختص

علمی جریدہ کے طور پر معین کی گئی ہے۔

اس مجلّہ کے لئے مقالہ لکھنے کے رہنما اصول

۱۔ مقالہ میں درج ذیل موارد کا ہونا ضروری ہے:

عنوان، خلاصہ، کلیدی کلمات، مقدمہ، موضوع کی وضاحت (یعنی تحقیق کا اصلی سوال)، تحقیق کے نظریاتی مبانی (یعنی کلیدی کلمات کی وضاحت)، تحقیق کی روش، مقالہ کی تحریر، نتیجہ گیری، منابع کی فہرست

۲۔ صرف ایسے مقالات کو مجلّہ میں قبول کیا جائے گا جو پہلے کسی بھی جریدے میں نہ چھپے ہوں۔ اور مصنف اس مقالے کو کہیں دوسری جگہ چھاپنے کا ارادہ نہ رکھتا ہو۔

۳۔ مقالہ میں تحریر شدہ مطالب کی علمی اور حقوقی طور پر تمامتر ذمہ داری خود مصنف پر عائد ہو گی۔

۴۔ مجلّہ کو مکمل حق ہے کہ وہ مقالے کو قبول یا رد کر دے۔

۵۔ مقالہ کو چھاپنے کے بارے میں آخری فیصلہ مجلس ادارت کی سفارشات کے مطابق، چیف ایڈیٹر کو ہوگا۔

۶۔ مقالہ کم از کم ۷ صفحات اور زیادہ سے زیادہ ۳۰ صفحات پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ (ہر صفحہ = ۲۵۰ الفاظ)

۷۔ اس مجلے کے مطالب کو مصدر کا تذکرہ کرتے ہوئے نقل کیا جا سکتا ہے۔

۸۔ مقالہ کی تحریر میں "علوی نستعلیق" کا فونٹ سائز ۱۴ استعمال کرنا ہوگا۔

۹۔ آخر میں منابع کی فہرست کو حروف الفباء کی ترتیب سے (حسب ذیل) مرتب کیا جائے گا:

اگر کتاب ہو تو: پہلے مصنف کا خاندانی نام، پھر مصنف کا اصلی نام، (کتاب کے نشر ہونے کا سال) **کتاب کا نام** "بولڈ فونٹ"۔ مترجم کا نام (اگر ترجمہ ہے)، چھاپ کا نمبر، مقام نشر، ناشر۔

اگر مقالہ ہو تو: پہلے مصنف کا خاندانی نام، پھر مصنف کا اصلی نام، (مقالہ کے نشر ہونے کا سال) **مقالے کا نام** "بولڈ فونٹ"۔ جریدے کا نمبر، جریدہ کے صفحوں کی تعداد۔

۱۰۔ خود تحریر میں منابع کے لیے ارجاعات: مصنف کا نام، نشر کا سال، صفحہ نمبر (توجہ رہے: فٹ نوٹ یعنی صفحہ کے نیچے نہیں بلکہ متن کے اندر ہی بریکٹ کے درمیان چھوٹے فونٹ سے لکھا جائے گا)

۱۱۔ صرف خاص موارد جیسا کہ مخصوص الفاظ کی انگلش میں معادل اصطلاح، یا الفاظ کی تشریح یا کسی چیز کی اضافی وضاحت کو فٹ نوٹ (اسی صفحے کے نیچے) لایا جا سکتا ہے۔

۱۲۔ مقالہ نگار کو چاہئے کہ اپنا مقالہ مجلے کی ای میل پر ارسال کرنے کے ساتھ ساتھ، اپنا علمی، اور تحصیلی تعارف بھی ارسال کرے۔

۱۳۔ مقالہ کے چھپنے کے بعد مجلے کا دفتر اس بات کا پابند ہے کہ اس مجلّہ کا ایک الکٹرانک نسخہ مقالہ نگار کو اس کے ای میل پر ارسال کرے۔

۱۴۔ مجلے کا ای میل ایڈریس: zikrofikrmag@gmail.com

فہرست مقالات

اداریہ...۸

آیت اللہ سید علی خامنہ ای (مدظلہ عالی) کے تفسیری اسالیب ۱۱

سید دانیال مہدی، غلام جابر محمدی

آیہ مودت تفسیر نمونہ اور تفسیر روح المعانی کی نگاہ میں... ٤٥

محمد نواز

قرآن وحدیث کی روشنی میں انتظار امام زمانہ کے مختلف پہلوؤں پر اجمالی نگاہ.. ٦٧

غلام جابر محمدی

فریقین کی روایات اور ادلہ کی روشنی میں: عول اور تعصیب کا بطلان ٨٥

سید محمد غضنفر فائزی

سیدہ نصرت امین اور آیت اللہ جوادی آملی کی نظر میں سحر (جادو) کا مفہوم، ماہیت، اور اُسکی اقسام ۱۱۳

سید محمد ریحان الرضا نقوی، سید محمد علی عون

تفسیر میں اسرائیلیات کی دخالت اور اس سے بچنے کے طریقے ۱۳٥

طیبہ اسماعیل

امامت؛ قرآن کی روشنی میں ۱٦۳

سید احتشام عباس زیدی، عون علی جاڑوی

اداریہ

اسلام کو آج کے جدید دور میں متعارف کروانے، معاشرے کو امن و امان کا گہوارہ بنانے اور دینی تہذیب و اسلامی اقدار سے ہم کنار کرانے کے لیے قرآن فہمی اور قرآن شناسی کی اشد ضرورت ہے ،قرآن شناسی درحقیقت خدا شناسی ہے ۔

قرآن شناسی کا راستہ بغیر تحقیق کے ممکن نہیں ہے۔قرآن پروردگار کی جانب سے عطا ہونے والی وہ نعمتِ اکبر ہےجس کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے ۔قرآن منشور زندگی اور مکمل ضابطہ حیات ہے جو نہ صرف ہماری دنیوی زندگی کے لیے لازم وضروری ہے بلکہ اس سے تمسک ، حیات بعد از موت کی بہتری کا بھی ضامن ہے۔جدید انداز میں یوں کہہ لیں کہ قرآن حیاتِ انسانی کا آپریٹنگ مینول ہے جس میں وہ تمام ٹولز اور ہدایات موجود ہیں جن کے تحت انسان کو آپ اپنے جسم کی مشینری کو استعمال کرنا چاہیے ۔پروردگار نے خود قرآن پر غور و فکر کی دعوت دی ہے ۔

"ہم نے یہ مبارک کتاب تمہاری طرف اتاری ہے ،تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل سلیم رکھنے والے اس سے روشنی اور رہنمائی حاصل کریں"

ہم اکیسویں صدی کا تقریباً چوتھائی حصہ گزار چکے ہیں ۔انتہائی تیزی کے ساتھ جدید ٹیکنالوجی، نت نئی ایجادات، اور بشریاتی علوم میں نئے موضوعات کا اضافہ ہورہا ہے ۔جدید موضوعات پر نئے سوالات اٹھ رہے ہیں ۔

پروردگار نے ہرشے کو قرآن مبین میں محصور کر دیا ہے ۔دنیا کا ہر خشک و تر قرآن میں ہے ۔ تحقیق کا در کبھی بند نہیں ہوتا۔جدید دور کے مسائل زیادہ گھمبیر اور الجھے ہوئے ہیں ۔قدماء کی تحقیق سے آگے کئی مسئلے ہیں ہردور کے تقاضے اور مسائل جدا ہوتے ہیں ۔اس دور میں قرآن حکیم پر پہلے سے زیادہ غور و فکر اور اس کے مخفی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے ۔گوکہ قرآن حکیم پر تحقیق ہوتی چلی آئی ہے لیکن ہر گزرتے وقت نے یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن ہر زمانے کے لیے ہے اور تاقیامت باقی رہنے والا کلام ہے۔

قرآن کی سب سے انفرادی اور بڑی صفت یہ ہے کہ یہ دیگر الہامی کتب کے مقابلے میں ہر قسم کی تحریف سے محفوظ ہے ۔پروردگار نے اشرف المخلوقات کو عقل سلیم سے نوازا ہے اس تعقل کا اس سے بہتر کوئی استعمال نہیں کہ کتاب خدا پر غور و فکر کیا جائے اور اس میں چھپے رموز و اسرار کو جانا جائے ۔ تحقیق اور تفکر و تدبر کے ذریعے ہی معاشرے کے جمود کو توڑا جا سکتا ہے اور قوانین فطرت کو مسخر کیا جاسکتا ہے ۔

آج کے اس جدید دور میں جبکہ دنیا ایک گلوبل ویلج بن چکی ہے اور ایک ڈیوائس کی صورت میں ایک کائنات انسان کی ہتھیلی پر دھری ہے ۔انگلی کے ہلکے سے اشارے پر ایک جہانِ دیگر کا نظارا ممکن ہے ۔علم حاصل کرنے کے لیے چین نہیں جانا پڑتا بلکہ تمام علوم تک رسائی گھر بیٹھے ممکن ہے تو ان تمام جدید ٹیکنالوجی اور علوم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آج کا نوجوان قرآنیات میں تحقیق کے نئے در کھول کر دنیا کے سامنے اسلامی اقدار اور تہذیب کا روشن چہرہ پیش کرسکتا ہے ۔تہذیب ایک مسلسل عمل اور صدیوں پر محیط ہے جس میں ہر دور اپنا حصہ جوڑتا چلا جاتا ہے ۔وقت کی ضرورت ہے کہ بھرپور توانائی کے ساتھ اپنا حصہ ڈالا جائے ۔اس سلسلے میں ادارے کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ جدید اور نئے قرآنی موضوعات پر تحقیق کی جائے ۔اسلامی تہذیب ایک آفاقی تہذیب اور قرآنی اقدار آفاقی اقدار ہیں جن میں ایک جہان آباد ہے ۔جسے دریافت کرتے رہنے کی ضرورت تاقیامت رہے گی کیونکہ قرآن حکیم قیامت تک کے لیے ہے لہٰذا ہر دور کے اپنے تقاضوں کے مطابق تحقیق کے باب وا ہوتے رہیں گے۔

سرسری تم جہان سے گذرے
ورنہ ہرجا جہان دیگر تھا

آیت اللہ سید علی خامنہ ای (مد ظلہ عالی) کے تفسیری اسالیب

سید دانیال مہدی[1]

ڈاکٹر غلام جابر محمدی

خلاصہ

امت مسلمہ اور اس کے تمام اسلامی فرقے قرآن مجید کو اللہ رب العزت کی جانب سے تکوینی اور تشریعی اصول و قوانین کی کتاب کے ساتھ ساتھ مذہبی احکام و فرائض اور وظائف دینی کو سمجھنے اور استنباط کرنے کے لئے اصلی اور بنیادی ترین ذریعہ سمجھتے ہیں۔ایسی کتاب جو کسی بھی نوعیت کی غلطی سے پاک اور محفوظ ہو، جو بنی نوع انسان کے لئے " تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ " اور مسلمین کے لئے ہدایت، رحمت اور بشارت ہو۔

دور جدید میں علوم قرآنیہ کے وسیع میدان میں تفسیری اسلوب اور منہج تفسیری کو اس کی اہمیت کے پیش نظر ایک اہم مقام دیا جاتا ہے اور یہی بحث مفسر کو آیات کے حقیقی معانی وبنیادی مقصد کو سمجھنے میں مدد فراہم کرنے کے سبب مہم بھی ہے۔

رہبر معظم آیت اللہ سید علی خامنہ ای کا شمار ان مفسرین میں ہوتا ہے جنہوں نے قرآن مجید کی تفسیر میں چند خاص مناہج اور اسالیب تفسیری کو مد نظر رکھا ہے اور اسی تناظر میں اپنے تفسیری مباحث کو بیان کیا ہے۔اس مختصر مقالے میں ان کے تفسیری مباحث میں معین اسلوب تفسیر کی نشاندہی کی گئ ہے۔ (مثالوں کے ساتھ) آیت اللہ سید علی خامنہ ای کا تفسیری منہج "اجتہادی " ہے۔ان کے قرآنی مباحث اور تفاسیر کے مطالعہ سے یہ بات

---

[1] ۱.ایم۔فل تفسیر وعلوم قرآن، المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

سمجھی جا سکتی ہے کہ وہ تفسیری اسالیب میں اگرچہ "روائی اسلوب تفسیر" اور "اشاری اسلوب تفسیر سے بھی استفادہ کرتے ہیں مگر مفسر بزرگوار "قرآن بالقرآن" کے اسلوب تفسیری کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔

بنیادی کلمات: سید علی خامنہ ای۔ تفسیر۔ تفسیری اسلوب۔ اجتہادی۔ اشاری۔ روائی۔ قرآن بالقرآن

تمہید

قرآن مجید بنی نوع انسان اور بالخصوص اہل اسلام کی دنیوی اور اخروی ہدایت کے لئے بنیادی اور اہم ترین منبع کی حیثیت رکھتا ہے۔ وحی الہی کی یہ کتابی صورت بنی نوع انسان کو مبداء و معاد، تکوین و تشریع اور نظام تخلیق کے حقائق سے آشنا کرنے کے ساتھ ساتھ ان پر موجود حاکم نظامات کا حقیقی ادراک عطا کرتی ہے۔ یہی کتاب الہی انسان کے انفرادی اور اجتماعی حقوق و فرائض کو بھی بیان کرتی ہے۔ سید المرسلین ، ختمی مرتبت حضرت محمدؐ رسول اللہ ہی اس کتاب کے پہلے معلم اور مربی ٹھہرے اور ان کے بعد اہل بیتؑ نے یکے بعد دیگرے اپنے اپنے اصحاب کو اس کی تعلیم دی اور پھر قرآنی تعلیم و تعلم کا یہ سلسلہ آج تک جاری و ساری ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مفسرین کرام نے حقائق قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے بہت کوشش اور محنت کی یہاں تک کہ بعض بزرگان نے اپنی تمام کی تمام زندگی اسی امر کے لئے وقف کر دی۔

جس مفسر نے بھی قرآن کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کی ہے اسے یقیناً خزائن قرآنی ملے اور اس نے اپنی تفسیر مین بیان کئے۔ یہ امر بدیہی ہے کہ ہر مفسر کے تفسیری مباحث میں اسکے علمی و فکری رجحانات کی تاثیر دکھائی دیتی ہے۔

یوں تو تاریخ میں اہل اسلام میں مکتب صحابہ کرام اور مکتب اہل بیتؑ یا پھر دیگر مکاتب (زیدیہ، اسماعیلیہ ۔۔۔) میں دسیوں بڑے بڑے مفسرین گزرے ہیں کہ جنہوں نے اپنے مختلف تفسیری اسالیب اور گوناگوں سلیقوں سے تفسیر قرآن کے سلسلے میں خدمات انجام دی ہیں اور یقیناً یہ کاوشیں قابل قدر ہیں مگر آیت اللہ سید علی خامنہ

ای کے تفسیری مباحث کو بعض ایسے امتیازات حاصل ہیں کہ جس سے باقی مفسرین محروم ہیں۔ان کے تفسیری مباحث راہ عدل و قسط کی مقدمہ سازی ہے۔ان کے تفسیری مباحث میں نہ صرف یہ کہ کسی قسم کا تعصب نہیں پایا جاتا بلکہ (یہ مباحث) اہل اسلام کے درمیان ایک وحدت کو تشکیل دیتے ہیں۔ وہ اپنے تفسیری مباحث میں آیات قرآنی کے ذریعے ہی ملت اسلامیہ اور بالخصوص خواص کو استکباری اور استعماری سازشوں اور چالبازیوں سے آگاہ کرتے ہیں اور قرآنی آیات سے ہی ان سے مقابلے کی تدبیریں اور عملی امور کی جانب رہنمائی کرتے ہیں۔انہوں نے بارہا اپنے خطابات میں قرآنی آیات سے ہی استدلال کرتے ہوئے جہاں تعلیمی، اخلاقی اور دینی امور کو بیان کیا ہے وہاں حکومتی مسائل اور بین الاقوامی امور میں اسلام کی رائے کو بھی صراحت سے بیان کیا ہے۔

مفسر بزرگوار کا اسلوب تفسیری اجتہادی ہے، تفسیر کے اجتہادی اسلوب سے مراد فکری کوشش ہے، اللہ رب العزت کی دی ہوئی عقل اور تفکراتی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے قرآنی آیات کے معانی و مفاہیم کا ادراک اور ان کے حقیقی اہداف و مقاصد تک رسائی حاصل کرنا ہے۔اجتہادی اسلوب میں عقل و خرد اور تدبر و تفکر پر تاکید کی جاتی ہے جبکہ اس کے برعکس روائی اسلوب تفسیر میں متون حدیث پر نسبتاً زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔

اسلوب تفسیری قرآن بہ قرآن

قرآنی آیات کی تفہیم و تفسیر اور ان کے حقیقی مفاہیم تک پہنچنے کے لئے قرآن مجید کی دیگر آیات سے مدد لینا قرآن بہ قرآن کا تفسیری اسلوب کہلایا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ بعض قرآنی آیات بعض دیگر قرآنی آیات کی تفسیر کے سلسلے میں منبع کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مفسرین (متقدمین و متأخرین) تفسیر کے اس اسلوب سے ناآشنا نہیں تھے۔بلکہ علمائے تفسیر و حدیث اس اسلوب تفسیر کو قدیمی ترین اسلوب اسلوب تفسیری قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ بالعموم علوم قرآنی میں صاحبان نظر کا نظریہ

یہی ہے کہ قرآنی آیات کی تفسیر کے سلسلے میں سب سے اہم منبع خود قرآنی آیات ہی ہیں۔ ان کے مطابق سب سے پہلے قرآن کی دیگر آیات سے ہی تفسیر کو سمجھنا چاہیے اگر قرآنی آیت نہ مل سکے تو دوسرے مرحلے میں حدیث کے ذریعے تفسیر آیات کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ کیونکہ قرآن کے بعد تفسیر قرآن کے لئے حدیث تو اہم ترین منبع ہے۔ خود رسول ختمی مرتبتؐ بھی اس اسلوب کے ذریعے تفسیر قرآن بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ احادیث اور سیرت کی کتب میں بھی ملتا ہے کہ انہوں نے متعدد مرتبہ قرآنی آیات کی وضاحت میں بعض دیگر آیات کی تلاوت کی، جیسا کہ صحیح بخاری میں بیان ہے کہ ایک مرتبہ رسول اکرمؐ سے کسی شخص نے آیت "لَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ "[1] میں کلمہ " ظلم " کی وضاحت دریافت کی تو رسول اکرمؐ نے "إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ "[2] کی تلاوت کرتے ہوئے معانی شرک کو واضح کیا۔ یہ اور اس سے ملتی جلتی دیگر احادیث اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ تفسیر کے اس اسلوب اور منہج (قرآن بہ قرآن) کی بنیاد خود رسول اکرمؐ نے رکھی ہے۔

اسی مانند امیر المؤمنین امام علیؑ کے متعلق بھی روایات و احادیث موجود ہیں جن میں انہوں نے اسی منہج (قرآن بہ قرآن) کے ذریعے آیات قرآنی کی تفسیر بیان کی ہے۔ مستدرک وسائل میں عبادة بن صامت سے روایت ہے[3] : وہ کہتے ہیں :ہیثم فوجی چھاؤنی میں تھا، جب وہ گھر لوٹا تو اس کی زوجہ کے یہاں ٹھیک چھ مہینے کے بعد بیٹا پیدا ہوا۔ ہیثم نے اس بچہ کو اپنانے سے انکار کر دیا اور اسے لیکر جناب عمر کے پاس پہنچ گیا اور ان سے مکمل قصہ بیان کیا۔ جناب عمر تمام قصہ سنتے ہیں اس خاتون کو سنگسار کئے جانے کا حکم دے دیا۔ اتنے میں امیر المؤمنین امام علیؑ

---

١ ۔ سورہ انعام، آیت ۸۲

۲ ۔ سورہ لقمان، آیت ۱۳

۳ ۔ امیر المؤمنین (علیہ السلام) -عَنْ عُبَادَةَ ابْنِ الصَّامِتِ قَال: وَ كَانَ الْهَيْثَمُ فِي جَيْشٍ فَلَمَّا جَاءَتْ امْرَأَتُهُ بَعْدَ قُدُومِهِ بِسِتَّةِ أَشْهُرٍ بِوَلَدٍ فَأَنْكَرَ ذَلِكَ مِنْهَا وَ جَاءَ بِهِ عُمَرَ وَ قَصَّ عَلَيْهِ فَأَمَرَ بِرَجْمِهَا فَأَدْرَكَهَا عَلِيٌّ (عليه السلام) مِنْ قَبْلِ أَنْ تُرْجَمَ ثُمَّ قَالَ لِعُمَرَ: ارْبَعْ عَلَى نَفْسِكَ أَنَّهَا صَدَقَتْ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى يَقُولُ وَ حَمْلُهُ وَ فِصالُهُ ثَلاثُونَ شَهْراً وَ قَالَ وَ الْوالِداتُ يُرْضِعْنَ أَوْلادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كامِلَيْنِ فَالْحَمْلُ وَ الرَّضَاعُ ثَلَاثُونَ شَهْراً. فَقَالَ عُمَرُ: لَوْ لَا عَلِيٌّ (عليه السلام) لَهَلَكَ عُمَرُ وَ خَلَّى سَبِيلَهَا وَ أَلْحَقَ الْوَلَدَ بِالرَّجُل.

وہاں پہنچے اور جناب عمر سے کہنے لگے: "اے عمر، ہوش کے ناخن لو۔۔! یہ خاتون سچ کہہ رہی ہے۔ اللہ تبارک و تعالی اپنی کتاب میں ارشاد فرماتا ہے "وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا "[1] اور پھر دوسری جگہ ارشاد رب العزت ہے "وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ "[2] لہٰذا حمل اور دودھ پلانے کی مدت دو سال یعنی تیس ماہ ہے۔ جناب عمر کہنے لگے: "اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر آج ہلاک ہو جاتا" اور یوں جناب عمر نے اس خاتون کو آزاد کر دیا اور بچے کو بھی اسی مرد کے ساتھ ملحق کر دیا۔[3]

پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ کے علاوہ صحابہ کرام اور تابعین نے بھی تفسیر کے اس منہج کو اپنایا اور قرآنی آیات کے ذریعے دوسری قرآنی آیات کی تفسیر بیان کی ہے۔

امیر المؤمنین امام علیؑ کے معروف ترین قرآنی شاگرد "ابن عباس" کہتے ہیں: "القرآن يفسر بعضه بعضاً" تفسیر کی ابتدائی کتب کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ خود ابن عباس اور اس زمانے کے دیگر مفسرین بھی اس منہج کے ذریعے قرآنی آیات کی تفسیر کیا کرتے تھے۔

اہل سنت اور شیعہ مفسرین کی بھی ایک بڑی تعداد نے اس منہج تفسیری کو اپنایا اور اپنی تفاسیر میں قرآن بہ قرآن کے ذریعے تفسیری مباحث کو بیان کیا ہے۔ جدید مفسرین میں مکتب اہل بیتؑ سے تعلق رکھنے والے ایرانی مفسر علامہ سید محمد حسین طباطبائی اس بات کے معتقد تھے کہ اگر قرآن مجید "تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ "[4] ہے تو خود قرآنی آیات کے لئے بھی ایسا ہی ہے۔ ایسا ممکن نہیں کہ قرآن مجید کائنات کی ہر چیز کی تبیین کرے لیکن اپنی (آیات قرآن) تبیین نہ کر سکتا ہو۔ لہٰذا اہل قرآن کو قرآن مجید کی تفسیر کے لئے قرآن مجید کی باقی آیات کی طرف رجوع کرنا ہوگا، تدبر اور تفکر کرنا ہوگا۔ وہ اس منہج کو منہج رسول اللہؐ اور منہج ائمہ معصومینؑ مانتے تھے۔

۱۔ سورہ احقاف، آیت ۱۵

۲۔ سورہ لقمان، آیت ۱۴

۳۔ نوری، میرزا حسین، مستدرک الوسائل، ج۱۵، ص ۱۲۳

۴۔ سورہ نحل، آیت ۸۹، "۔۔۔وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ"

متون حدیث میں بیان ہونے والی روایات کی یہ نوعیت تفسیر قرآن بہ قرآن کی روشن مثالیں ہیں۔قرآن بہ قرآن کا یہ تفسیری منہج اسلام کے ابتدائی ایام سے دور حاضر کے جدید مفسرین تک چلتا آرہا ہے۔آیت اللہ سید علی خامنہ ای نے بھی اپنے تفسیری مباحث میں اس روش سے خوب استفادہ کیا ہے۔

آیت اللہ سید علی خامنہ ای کا اسلوب تفسیر قرآن بالقرآن

پہلی مثال

آیت اللہ سید علی خامنہ ای حکومتی عہدے داروں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :[1]

طول تاریخ میں بنی نوع انسان نے بڑے بڑے گناہ، ظلم و ستم اور بھیانک جرائم زمام حکومت کے ذریعے ہی انجام دئے ہیں۔ عوام الناس پر مسلط حکمرانوں کے وہ گناہ اور مظالم جو عوام یا پھر ان کی تقدیر کے ساتھ روا رکھے گئے ہیں عام لوگوں کے گناہان کبیرہ سے کسی بھی صورت قابل مقایسہ نہیں ہیں ۔ حکمراانوں کے گناہ بہت بھاری اور بھیانک نتائج لئے ہوئے ہیں۔ بشریت بالعموم دوران حکومت علم و حکمت ، اخلاق و اقدار اور عقل و فکر سے محروم رہی ہے۔حکومتی ایوانوں میں دیگر شعبہ ہائے زندگی کی نسبت تدبیر اور منطق کو بہت کم بروئے کار لائے ہیں۔انسانوں کے جس گروہ نے اس غیر عقلانی حکومت اور بے جا مظالم کی قیمت چکاتی آئی ہے وہ ہمیشہ عوام ہی رہی ہے۔ یہ حکومتیں ابتداء میں تو انفرادی طور پر مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اجتماعی اور منظّم انداز میں ظلم و استبداد اور لوٹ مار کا بازار گرم کرتی آرہی ہیں۔ لہٰذا نبوت و رسالت کی بنیادی ترین ذمہ داریوں میں سے ایک دنیا میں اللہ کی نعمتوں کو ضائع اور برباد کرنے والے شیطان صفت انسان یا پھر حکومتوں کے بالمقابل ڈٹ جانا اور مقابلہ کرنا ہے۔" وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ "[2]

---

۱ ۔ ۴ مارچ، ۲۰۰۲، (۲۷/۱۲/۱۳۸۰)

۲ ۔ سورہ بقرہ، آیت ۲۰۵

قرآن مجید ان مفسد حکومتوں (کرپٹ اقتدار) کے متعلق ہمیشہ ایسے بھیانک اور دل دہلانے والے کلمات کا استعمال کرتا ہے۔ان کی کوشش ہے کہ ان کا یہ فساد اور کرپشن ہر طرف پھیل جائے۔"أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ـ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا ۖ وَبِئْسَ الْقَرَارُ"[1]

انہوں نے اللہ تعالی کی جانب سے انسانی اور فطری نعمتوں کو کفر و شرک اور ضلالت و گمراہی میں بدل دیا ہے۔ انہوں نے انسانوں کو ان نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کی بجائے ان سے محروم کر دیا۔ اللہ کی یہ نعمتیں بنی نوع انسان کے لئے ہیں لیکن ان شیطان صفت وحشیوں نے ان تمام نعمتوں کو اپنی نفسانی خواشات کی آگ میں جلا کر راکھ کر دیا ہے۔

اللہ کے بھیجے انبیاء و رسل ان کے سامنے صف آرا ہو گئے۔گذشتہ ادوار میں انبیاء الہیؑ اگر ان ظالموں اور ستمگروں سے نہ ٹکراتے اور علم حق بلند نہ کرتے تو جنگ اور معرکہ آرائی کی نوبت ہی نہ آتی۔ ذرا غور کیجئے قرآن مجید اسی جانب متوجہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: " وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ "[2] کتنے ہی انبیاء اور ان کے ساتھ خداپرست اور جانثار ساتھیوں نے جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لیا۔ غور طلب امر یہ ہے کہ انبیاء کرامؑ اور ان کے اصحاب کی یہ جنگ کس کے ساتھ ہوئی؟ وہ کون تھے جنھوں نے انبیائے الہی اور ان کے ساتھیوں سے قتال کیا؟ پیغمبروں کے مدمقابل آنے والی یہ طاقتیں کون تھیں؟ یقیناً بنی نوع انسان کو بدبخت اور نامراد کر دینے والی فاسد اور جاہ طلب حکومتیں ہی تھیں۔انہیں سرکش اور طاغوت صفت حکومتوں نے ہی اللہ کے بھیجے پیغمبروں اور ہادیان برحق سے جنگ وجدال جاری رکھا۔"

خطاب کے اس حصہ میں مفسر بزرگوار نے تفسیر قرآن بہ قرآن کے ذریعے دنیا کی ظالم و جابر حکومتوں اور جاہ طلب مقتدر بادشاہوں کے مدمقابل اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کی ذمہ داریوں کی تبیین فرما رہے ہیں۔ مفسر

۱۔ سورہ ابراہیم، آیت ۲۸، ۲۹

۲۔ سورہ آل عمران، آیت ۱۴۶

بزرگوار نے درج بالا تین آیات کو مد نظر رکھتے ہوئے انبیائے الٰہی کے اہداف کو بیان کرتے ہوئے ان کے اہم ترین کاموں کو بیان کیا ہے۔

دوسری مثال

آیت اللہ سید علی خامنہ ای نے سورہ توبہ کی آیت نمبر ۵۱ "قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ "کے ذیل میں "توکل" کی تفسیر بیان کرتے ہوئے قرآن مجید کی دیگر آیات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ انہوں نے موضوع توکل کی بہتر تبیین کے لئے سورہ عنکبوت آیت ۵۹، سورہ نساء آیت ۸۱، سورہ یونس آیت ۷۱، سورہ ہود آیت ۵۳ تا ۵۶، سورہ ابراہیم آیت ۱۲ اور سورہ مجادلہ کی آیت نمبر ۱۰ کا سہارا لیا ہے۔ مفسر بزرگوار نے آیت ۵۱ کے ذیل میں موضوع "توکل" پر سیر حاصل گفتگو کی ہے جس کا خلاصہ ہم یہاں بیان کئے دیتے ہیں:

اللہ تعالی پر توکل، مؤمنین کی نشانی

"وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ " مؤمنین کو چاہئے کہ وہ اللہ پر توکل کریں، دوسرے الفاظ میں اگر اللہ پر توکل نہ کیا جائے تو ایمان کامل نصیب نہیں ہو سکتا۔ اسلام کے نزدیک آئیڈیل اور مطلوب شخصیت وہ ہے کہ جو توکل کرنا جانتی ہو۔ اسلام میں اللہ پر توکل انتہائی اہم مسئلہ ہے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ ایمان کامل کی ایک اہم نشانی توکل ہے۔

اللہ پر توکل کا حقیقی مفہوم اپنے امور کو اللہ کے سپرد کرنا ہیں، لیکن اگر ہم توکل سے یہ مراد لیں کہ مسلمان اپنے امور کو بغیر کسی قید و شرط کے اللہ کے سپرد کردے (اگرچہ آج کا مسلم معاشرہ یہی مفہوم سمجھے بیٹھا ہے) تو یہ نہ تو توکل کا صحیح اور حقیقی مفہوم ہے اور نہ ہی مکتب اسلام میں مطلوب ہے۔

توکل کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ انسان مطلوبہ ہدف کے حصول کے لئے اپنے پاس موجود تمام وسائل و ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے اس امر کی جانب متوجہ رہے کہ اللہ رب العزت کی ذات مقدس تمام مادی و معنوی وسائل پر حاکم ہےاور ساتھ ساتھ وہ اپنے وظیفہ اور تکلیف شرعی پر عمل کرنے کے سبب مطمئن ہو کہ جب وہ اپنا شرعی وظیفہ ادا کر چکا ہے تو اللہ تعالی بھی اسے اس امر کی جزاء عنایت کرے گا اور اس کے کام کو نتیجہ تک پہنچائے گا۔

اس کے بعد رہبر معظم رقمطراز ہوتے ہیں: "قرآنی آیات کا مطالعہ بھی ہمیں یہی بتلاتا ہے کہ توکل کا معنی اپنی توان اور حصے کا کام مکمل کرنا ہے۔ مثلاً رسول ختمی مرتبتؐ کے اصحاب کو مشکلات برداشت کرنا تھیں، انہیں غزوات میں شرکت کرنا تھی، دشمن کا مقابلہ بھی کرنا تھا، رسول اکرمؐ کی جانب سے دی گئی تمام ذمہ داریاں انجام دینی تھیں، ہاں یہ سب کرنے کے بعد نتیجہ اللہ رب العزت پر چھوڑ دینا توکل کہلاتا ہے۔

اسی مقام پر نقطہ انحراف قرار پاتا ہے، بعض افراد توکل اور اللہ پر بھروسہ کرنے پر ایمان کامل رکھتے ہیں لیکن اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی سے غافل رہتے ہیں، اپنے شرعی وظیفے پر عمل نہیں کرتے۔ اللہ تبارک وتعالی پر اس نوعیت کا بھروسہ "توکل" نہیں کہلاتا۔ بنیادی طور پر توکل کے دو بنیادی عناصر ہیں، ان دو عناصر کا ایک ہی وقت میں موجود ہونا ضروری ہے۔ پہلا رکن اپنے شرعی وظیفے پر عمل کرنا اور دوسرا رکن نتیجے پر اطمینان ہے اور یہ ایمان ہو کہ خداوند عالم ہی تمام اسباب و ذرائع پر قادر مطلق ہے۔ لہٰذا جب تک توکل کے یہ دو ارکان اکٹھے نہ ہوں توکل بے معنی ہوگا۔"

دنیا کے (materialistic) یہاں دوسرے رکن کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ان کی کمزوری اس طرف سے ہے۔ وہ مقدمات کو انجام دیتے ہیں لیکن حاصل ہونے والے نتائج کے متعلق اللہ کی قدرت پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ وہ یا تو صرف اپنی صلاحیات پر اعتماد کرتے ہیں کہ جو خود ایک واضح غلطی ہے یا پھر دوسری طرف سے مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یعنی وہ مقدمات امر کو انجام تو دیتے ہیں لیکن نتائج کے سلسلے میں مایوس رہتے ہیں۔

دینی طبقہ جات میں سے بعض کے یہاں اس کے بر عکس پہلے رکن کے بارے غلط فہمیاں موجود ہیں۔یہ طبقہ اگرچہ اللہ پر بھروسہ کرتا ہے لیکن اپنے آپ کو سعی و کوشش سے مستثنیٰ سمجھتا ہے۔انکی توکل سے مراد اللہ کی قدرت پر اعتماد ہے بغیر کسی کوشش اور اپنی ذمہ داری انجام دیئے۔یہ چاہتے ہیں کہ یہ اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں کوئی کام انجام نہ دیں اور انکی چھتوں سے ہی ان کا رزق برستا رہے۔اپنا وظیفہ انجام نہیں دیتے ،کام نہیں کرتے لیکن انکا دل زمین وآسمان کے خزانوں کے لئے بے تاب رہتا ہے۔ یہ دونوں تصورات غلط ہیں۔ بعض اہل یورپ کے محققین نے جب اسباب زوال اہل اسلام کو بیان کیا تو اس میں توکل کے نادرست مفہوم کو ایک بنیادی ترین سبب گنوایا ہے اور حقیقت میں بھی ایسا ہے۔اگر کسی قوم کو بدبخت کرنا ہو تو اس کا آسان ترین راستہ یہی ہے کہ توکل کے نادرست مفہوم کو ان میں رائج کردیا جائے۔ تاریخ میں بنی اسرائیل سے متعلق ملتا ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا: "اگر شہر بیت المقدس ہی لینا ہے تو آپ اور آپ کا رب جائیں ، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں" قرآن مجید کی آیت مجیدہ ہے کہ : " قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِنَّا لَنْ نَدْخُلَهَا أَبَدًا مَا دَامُوا فِيهَا ۖ فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ "[1]

لیکن جب ہم قرآن مجید کی آیات مبارکہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو بلاشبہ توکل کا مفہوم قدرے مختلف سامنے آتا ہے۔ہم نے قرآن مجید میں کلمہ "توکل" کے استعمالات کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ آیات قرآنیہ میں کن افراد کو توکل کرنے کی تاکید کی گئی اور کن افراد کو اس صفت سے موصوف کیا گیا ہے؟

درحقیقت قرآن مجید میں "توکل" اہل عمل کی صفت بیان کی گئی ہے۔اگر سعی و کوشش نہیں کی اپنی صلاحیات کا صحیح استعمال نہیں کیا تو توکل بے معنی ہو جائے گا۔ کسی انسان کو متوکل (توکل کرنے والا) تبھی کہا جائے گا جب وہ اپنے اندر موجود تمام قوات اور صلاحیات سے کام لے ، کوشش کرے، محنت کرنے اور اس کے بعد اپنے پروردگار

۱۔ سورہ مائدہ، آیت ۲۴

کی جانب متوجہ ہو کہ یہ تمام صلاحیات، استعداد اور قوتیں اسی کی عطا کردہ ہیں اور وہ جب چاہے انہیں واپس لے سکتا ہے۔ یہ توکل کے حقیقی معانی ہیں۔ قرآن مجید نے توکل کو ایک کوشش کرنے والے فرد کی صفت بیان کیا ہے۔ملاحظہ کیجئے:"وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ نِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ "[1] اور جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں اور ہم انہیں جنت کے بلند و بالا محلات میں جگہ دیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، عاملین (عمل کرنے والوں) کے لئے کیا ہی اچھا اجر ہے۔

اب یہاں پر اگلی ہی آیت میں عاملین یعنی عمل کرنے والوں کی صفات بیان کی جارہی ہیں:"الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ "[2] یعنی عاملین کہ جن کے لئے سابقہ آیت میں جنت کے انعام و اکرام بیان کئے گئے وہ اہل صبر و استقامت اور راہ حق کے مد مقابل آنے والی تمام رکاوٹوں کے سبب پیچھے نہیں ہٹتے اور اللہ پر توکل کرنے والے ہیں۔

بنابراین، اگر ہم نے اپنے کام اور ذمہ داریاں درست انداز میں انجام نہ دیں اور زبان حال سے کہیں کہ: " اے اللہ! تو اپنی ربوبیت کے تمام امور کو انجام دے اور میری عبودیت کے کاموں کو بھی تو ہی انجام دے تو اسے توکل نہیں کہا جائے گا بلکہ اسے اسلامی مفاہیم سے کھیلنا اور ان کا مزاق اڑانا کہا جائے گا۔"

سورہ نساء میں بھی ایسے موقع پر توکل کرنے کی نصیحت کی گئی ہے جہاں انسان نے اپنی تمام تر کوشش اور سعی کی ہو۔"وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ ۖ وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ ۖ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلاً "[3] یہ آیت بھی منافقین کے کردار اور رویے کے بارے بات کر رہی

۱۔ سورہ عنکبوت، آیت ۵۸

۲۔ سورہ عنکبوت، آیت ۵۹

۳۔ سورہ نساء، آیت ۸۱

ہے۔آیت کہہ رہی ہے: "اور یہ لوگ (منہ پر تو) کہتے ہیں: اطاعت کے لئے حاضر (ہیں) لیکن جب آپ کے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ آپ کی باتوں کے خلاف رات کو مشورہ کرتا ہے، یہ لوگ راتوں کو جو مشورہ کرتے ہیں اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ پس (اے رسولؐ) آپ ان کی پرواہ نہ کریں اور اللہ پر توکل کریں اور کارسازی کے لئے اللہ کافی ہے"

مذکورہ آیت میں توکل کا حکم اسی صورت میں دیا جارہا ہے جب جب انسان اپنی ذمہ امور کو انجام دے چکا ہو۔ یعنی جو اللہ رب العزت کی جانب سے اسے حکم دیا گیا ہے وہ اس پر عمل پیرا ہو۔ایسی صورت میں آیت مجیدہ خداوند عالم پر توکل کرنے کا کہتی ہے،نہ یہ کہ اپنی ذمہ داری انجام نہ دیں اور اللہ پر توکل کریں۔

اس مقام پر آیت اللہ سید علی خامنہ ای نے موضوع توکل کی تفسیر کے لئے قرآن بالقرآن کے اسلوب تفسیر کو اپنایا اور انہوں نے چند آیات کے ذریعے "توکل" کے مفہوم کو واضح کرتے ہوئے اس کے بنیادی اور اساسی ارکان کی جانب متوجہ کیا۔پہلا متوکلین کا عامل ہونا اور اپنی ذمہ ادریوں کو انجام دینا ہے اور دوسرا اپنی تمام تر ذمہ داریاں تدبیر و حکمت سے انجام دینے کے بعد اللہ رب العزت سے نتائج کی امید رکھنا۔

روائی(حدیثی) اسلوب تفسیر

روائی اسلوب تفسیر سے مراد تفسیر قرآن مجید کا ایسا اسلوب کہ جس میں آیات قرآنی کی تفسیر احادیث معصومینؑ کے ذریعے ہو۔اس اسلوب تفسیری کو "منہج اثری" کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ تفسیری اسالیب کی فرجہ بندی کے اعتبار سے اسلوب قرآن بالقرآن کے بعد اسی اسلوب کا مرتبہ آتا ہے۔ مفسرین کا ایک گروہ اسلوب تفسیر روائی کی اہمیت کے پیش نظر قرآن مجید کی تفسیر میں صرف اسی اسلوب کو معتبر سمجھتے ہیں۔

اسلام کے ابتدائی ایام سے ہی اصحاب رسول اکرمؐ خود رسولؐ سے آیات قرآنی کی تفہیم کے لئے سوال کرلیا کرتے تھے ،اسی سبب باب تفسیر میں رسول اللہؐ سے بہت سی احادیث بیان ہوتی ہیں۔ علمائے اہل تسنن اور اہل تشیع

دونوں کے یہاں اس اسلوب تفسیری سے خوب استفادہ کیا جاتا ہے۔رسول اللہؐ سے منقول احادیث تو فریقین میں بلا کسی شک و تردید مورد قبول اور ہمیشہ سے ہی مفسرین کے لئے جائے قرار ہے۔مکتب صحابہ میں اصحاب رسول اللہؐ اور تابعین کے اقوال بھی روایت شمار کئے جاتے ہیں لیکن مکتب اہل بیتؑ میں صرف اور صرف اقوال معصومینؑ کو ہی روایت کا درجہ دیا جاتا ہے کہ جن کے ذریعے قرآنی آیات کی تفسیر کی جا سکتی ہے۔قرآن مجید خود بیان کرتا ہے کہ : " وَ أَنْزَلْنا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ ما نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ "[1] یعنی "اور (اے رسولؐ) آپ پر بھی ہم نے ذکر اس لئے نازل کیا ہے تا کہ آپ لوگوں کو وہ باتیں کھول کھول کر بتا دیں جو ان کے لئے نازل کی گئی ہیں اور شاید وہ (ان میں) غور کریں۔" اس آیت قرآنی میں کس قدر صراحت سے بیان ہوا ہے کہ رسول اکرمؐ ابلاغ آیات الہی کے علاوہ تبیین آیات الہی کے بھی ذمہ دار ہیں۔دور حاضر کے عظیم مفسر علامہ محمد حسین طباطبائی اسی آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ : "یہ آیت پیغمبر گرامیؐ کے آیات قرآنیہ کی تفسیر و تبیین سے متعلق اقوال کی حجیت پر دلالت کرتی ہے۔یعنی یہ آیت مجیدہ رسول اکرمؐ کی تفسیری روایات کی حجیت کے لئے کافی و وافی ہے۔اسی مانند یہی آیت اہل بیتؑ عصمت و طہارت سے نقل ہونے والی تفسیری روایات کو بھی حدیث متواتر ثقلین کے سبب شامل ہے۔ لیکن باقی امت مسلمہ کی جانب سے بیان ہونے والے اقوال اب چاہے وہ اصحاب و تابعین ہوں یا علمائے کرام کے اقوال و نظریات نہ حجت ہیں اور نہ ہی آیت میں شامل ہیں۔"[2]

رسول ختمی مرتبتؐ سے روایت ہے کہ:" ألا إنّي قد اوتيت القرآن و مثله معه"[3] یعنی "آگاہ رہو کہ مجھے قرآن اور اس کی مثل دی گئی ہے۔"روایت میں مثل سے مراد حضور اکرمؐ کو اللہ کی جانب سے دیا گیا علم اور تبیین دین

۱۔سورہ نحل، آیت ۴۴

۲۔طباطبائی، سید محمد حسین، تفسیر المیزان، ج ۱۲، ص ۲۴۶

۳۔احمد بن محمد ابن حنبل، مسند احمد، ج ۴، ص ۱۳۱؛ سجستانی، ابو داود سلیمان بن اشعث ازدی سنن ابی داوٗد، ج ۲، ص ۳۹۲

ہے، جسے بعض محققین کی تعبیر میں قرآن مجید کے علاوہ دیگر حقائق عالم کہا جاسکتا ہے۔ ہم باآسانی کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہؐ خود قرآن مجید کے پہلے مفسر ہیں۔

اس زمانے میں قرآن مجید کی آیات کی تفسیر و تبیین کو درک کرنا اور سمجھنا نسبتاً عربی زبان کے سبب آسان تھا۔ اسی سبب اس زمانے میں اصحاب کی اکثریت بیشتر قرآن کو باآسانی سمجھ رہی تھی، لیکن اس کے باوجود عقل و نقل اور تاریخی واقعات اس امر پر شاہد ہیں کہ بڑے بڑے اصحاب بھی بہت سے قرآنی مفاہیم سے نابلد تھے، وہ تفسیر و تاویل کے لئے خود رسول اللہؐ اور امیر المؤمنین امام علیؑ سے رجوع کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ عبد اللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہؐ سے جب قرآن مجید پڑھتے تھے اس وقت تک اگلی آیات کی جانب نہیں بڑھتے تھے جب تک پچھلی دس آیات پر عبور حاصل (معانی کلمات اور اسلوب عمل کی معرفت) نہیں کر لیتے تھے۔[1] اسی مانند عبد اللہ ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ سے کسی نے پوچھا کہ قرآن مجید میں "الَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِينَ "جو بیان ہوا ہے اس میں کلمہ " عِضِينَ " سے کیا مراد ہے؟ رسول اکرمؐ اس شخص سے فرماتے ہیں: "قرآن کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہیں اور دوسرے حصے کا کفر (انکار) کر دیتے ہیں "[2]

پیغمبر اکرمؐ کے بعد امیر المؤمنین امام علیؑ اور ان کے بعد ائمہ معصومینؑ نے تفسیر قرآن کو اس کے کمال تک پہنچایا۔ خود اصحاب رسول اللہؐ کا قرآنی مباحث میں امیر المؤمنین امام علیؑ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنا بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔

امام علی رضاؑ سے روایت ہے کہ: "لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ جس طرح قرآن نازل ہوا ہے اسے پڑھیں اور جب انہیں تفسیر کی ضرورت ہو تو ہماری جانب سے ان کی ہدایت اور رہنمائی کی جائے گی کیونکہ ہم اہل بیتؑ رسول اللہؐ کی ہی بتائی ہوئی تفسیر کو واضح اور روشن کیا کرتے ہیں۔"

۱۔ طبری، محمد ابن جریر، تفسیر طبری، ج۱، ص ۲۷

۲۔ سیوطی، جلال الدین عبد الرحمٰن بن ابی بکر، تفسیر در منثور، ج۵، ص ۹۸

آیت اللہ سید علی خامنہ ای کا روائی اسلوب تفسیر

آیت اللہ سید علی خامنہ ای اپنے تفسیری مباحث میں جہاں اسلوب تفسیری قرآن بالقرآن کو اہمیت دیتے ہیں وہاں روائی اسلوب تفسیر کو بھی اپنا مقام دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے تفسیری مباحث میں جگہ جگہ پر نبی اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ سے بیان ہونے والی احادیث کو بیان کیا ہے۔ وہ خود اس امر کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں : " بہت سی قرآنی آیات ایسی ہیں کہ جنہیں عام سادہ ذہن اور عقلی استطاعت درک نہیں کر پاتی۔ زمانہ قدیم میں معمولی اذہان ان آیات کو نہیں سمجھ پا رہے تھے لیکن آج انہی آیات کو سمجھنا ممکن ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہیں آیات کو اب سمجھنا کیسے ممکن ہے؟ اس لئے کہ سائنسدانوں نے ایٹم کو دریافت کر لیا ہے، نہیں ایسا ہر گز نہیں ہے۔ یہ معلومات ہمیں قرآنی مفاہیم کو سمجھنے میں زیادہ معاون نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بنی نوع انسان کے لئے قرآنی مفاہیم کی تبیین میں اہل بیتؑ عصمت و طہارت کا ہی بنیادی ترین کردار ہے۔ انہوں نے ہی وحی الٰہی کے نورانی پیغام کو لوگوں میں عام کیا۔ انہوں نے ہی حقیقی معرفت کو بیان کیا۔ وہی بنی نوع انسان کی عقل و معرفت اور نظام فکری کے عروج کا سبب بنے۔ انسان جب ان کے بیان کئے گئے حقائق اور فرامین کا مطالعہ کرتا ہے اور ان کے جملوں سے دلی لگاؤ لگاتا ہے تو قرآنی مفاہیم روشن اور واضح ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں مجھے یوں کہنے دیجئے کہ جب کوئی انسان حقیقی اسلام شناس کرداروں کے فرامین کی رہنمائی میں قرآنی مفاہیم کو سمجھنا شروع کرے تو آیات الٰہی اپنے اندر سموئے حقائق کو کھول کھول کر بیان کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ "قرآن و اہل بیتؑ ایک حقیقت ہیں " کا مطلب یہ ہے۔ اہل بیتؑ انسانی فہم و فراست کو بلند کر دیتے ہیں۔ وہ لوگوں کے شعور کو قرآن مفاہیم سمجھنے کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔ وہ انسان کو قرآن کی ہمراہی میں چلنا سکھاتے ہیں۔ وہ قرآنی آیات سے استنباط اور نتیجہ اخذ کرنا سکھاتے ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید میں بہت سے احکامات ایسے ہیں کہ جنہیں اجمالاً بیان کیا گیا ہے۔ انہوں نے ہمارے لئے ان احکام کی تفصیل بیان کی ہے۔ بعض افراد کہتے ہیں کہ قرآن مجید کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ نہیں بالکل ایسا نہیں ہے۔ ممکن ہے، اچھی طرح سے ممکن ہے۔ ہم کیوں نہ سمجھ پائیں،

قرآن مجید لوگوں کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے۔ہاں، اگرچہ اس میں مشکل اور مشتبہ آیات موجود ہیں لیکن رسول اکرمؐ نے ان مشکل اور مبہم آیات کو کھول کھول کر بیان کر دیا ہے۔ مجمل امور کو بہت سے احکام کے ضمن میں واضح کیا ہے۔اگر پیغمبر گرامیؐ نہ ہوتے تو لوگ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ ظہر کی نماز چار رکعت ہے۔اگر پیغمبرؐ نہ ہوتے تو لوگوں کے لئے اسلام کے سادہ سے سادہ احکامات بھی سمجھنا دشوار ہوتا مثلاً نماز جمعہ ہی کو لے لیجئے رسول اکرمؐ نے ہوتے تو اس کی ادائیگی کو کیسے سمجھتے۔دیکھیں۔۔! قرآن مجید میں صرف یہی جملہ ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ "[1] اللہ کے ذکر کی جانب تیزی سے آؤ، اب یہاں کیا کیا جائے۔ہم جلدی جلدی مسجد پہنچ گئے اور نماز جمعہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔کیسے ادا کریں؟ یہاں ہمیں رسول اکرمؐ کی تبیین و تفسیر کی ضرورت پڑتی ہے۔ بالکل ایسی طرح وحی الٰہی کو درست انداز میں سمجھنے کے لئے ہمیں جگہ جگہ پیغمبر اکرمؐ کی ضرورت ہے۔"[2]

مندرجہ بالا عبارت اس امر پر واضح دلیل ہے کہ آیت اللہ سید علی خامنہ ای تفسیر قرآن مجید کے سلسلے میں رسول اکرمؐ اور اہل بیتؑ سے منقول تفسیر و تأویل کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اسی سبب ہمیں ان کی تفسیر میں جابجا روایات معصومینؑ نظر آتی ہیں۔

مفسر محترم سورہ توبہ آیت نمبر ٦٠ : "إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ "[3] کی تفسیر میں لفظ " الصَّدَقَاتُ " کی وضاحت بیان کرتے ہوئے ایک مقام پر رقمطراز ہوتے ہیں : "ہمیں اس امر کی جانب متوجہ رہنا چاہیے آیات الٰہی کے مفاہیم کو سمجھنے میں کسی (اہل سنت یا اہل شیعہ) مرجع تقلید یا پھر فقیہ کا فتویٰ حجت نہیں

۱ ۔ سورہ جمعہ، آیت ۹
۲ ۔ خامنہ ای، آیت اللہ سید علی، شرح نہج البلاغہ (خطبہ نمبر ۷)
۳ ۔ سورہ توبہ، آیت ٦٠

ہے۔ قرآنی آیات سے متعلق جو امر حجت ہوگا وہ پہلے مرحلے میں خود آیت کا ظہور اور دوسرے مرحلے میں رسول اکرمؐ اور اہل بیتؑ سے منقول روایات ہیں۔

لہٰذا پہلے مرحلے میں ہمیں آیت پر توجہات کو مرکوز کرنا ہوگا اور دیکھنا ہوگا کہ خود آیت ہمیں کیا سمجھا رہی ہے۔ یہاں پر آیت میں صدقات کی بات ہوئی ہے ارشاد رب العزت ہے: "صدقات فقراء اور مساکین۔۔۔کے لئے ہیں" ذرا قرآن مجید کے الفاظ پر توجہ دیجئے: " إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ۔۔" بیان ہوا ہے نہ کہ " إِنَّمَا الزَّكَاةُ لِلْفُقَرَاءِ" کا ذکر ہے۔ زکوۃ، بالعموم فقہ اسلامی میں خاص قوانین و شرائط کو لئے ہوئے ہے۔ لہٰذا یہاں صدقات سے مراد زکوۃ لینا مناسب نہیں ہے۔ البتہ اس موضوع کے بارے بعض اصحاب نظر کے ایک مختلف رائے بیان کرتے ہیں، ان کے مطابق قرآن مجید میں زکوۃ سے مراد عموم انفاق ہے۔ یعنی زکوۃ کا قرآنی مفہوم صرف نو (۹) معین اشیاء (گندم، جو، کھجور، کشمش، سونا، چاندی، بھیڑ، گائے اور اونٹ) پر منحصر نہیں ہے بلکہ اسلام اور قرآن نے جن جن انفاقات کا ذکر کیا ہے ان سب کو شامل ہے۔ لہٰذا اس نظریہ کے مطابق انفاق کی تمام اقسام کو زکوۃ کہا جائے گا۔ ہمارا موضوع بحث یہ نہیں ہے۔ لیکن زکوۃ کا ایک دوسرا مفہوم اصطلاح فقہاء میں بیان ہوتا ہے جسے سادہ انداز میں یوں بیان کیا جاتا ہے کہ " معین مال کا ایسا حق جسے معین اشیاء سے معین مقدار میں لے کر معین مقام پر خرچ کیا جائے۔" نتیجتاً فقہاء کے نزدیک اس آیت میں بیان ہونے والے لفظِ صدقات سے مراد وہی زکوۃ ہے جسے ابواب فقہ میں اس کے موارد اور مصارف کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا چند آیات قبل آیت نمبر ۵۸ میں بیان ہونے والا کلمہ "صدقہ" زکوۃ سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟ اگر زکوۃ کے ہی معانی میں ہے تو یہ سوال ابھرے گا کہ کیا صدقہ صد در صد زکوۃ کے معانی میں استعمال ہوگا، یعنی جہاں لفظ صدقہ آئے گا اس سے مراد وزکوۃ ہی ہوگی اور جب بھی کلمہ زکوۃ آئے گا اس سے مراد وہی صدقہ ہوگا، یا پھر ہم یوں کہیں گے کہ زکوۃ صدقہ کی ایک قسم ہے؟

پہلی بات تو یہ کہ احادیث میں آیت "وَمِنْهُمْ مَنْ يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ " سے متعلق جو شأن نزول بیان کیا گیا ہے شاید وہی اس کے معانی کو واضح کر دے گا۔

دوسری بات یہ کہ ہمیں ان کتب لغت کی طرف رجوع کرنا چاہئے کہ جس میں ان جیسے کلمات کی لغوی اور اصطلاحی وضاحت کی جاتی ہے تاکہ اس ذریعے آیت کے درست مفہوم تک پہنچ سکیں۔

آیت نمبر ۵۸ کے شان نزول میں وارد ہونے والی احادیث[۱] یہ امر واضح کر رہی ہیں کہ مذکورہ آیت جنگ حنین کے دوران نازل ہوئی ہے اور نزول آیت کا سبب بھی یہ بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے اس جنگ میں حاصل ہونے والے مال غنیمت میں سے بعض اہل قریش کو باقیوں کی نسبت زیادہ حصہ دیا۔ انصار میں اس موضوع پر چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ انصار اس امر پر اعتراض کرنے لگے اور ایک گروہ کی شکل میں رسول اللہؐ کے پاس پہنچے۔ جیسا کہ روایات میں دیکھا جا سکتا ہے کہ انہوں نے رسول اکرمؐ سے کہا: "اے اللہ کے رسولؐ، آپ نے مال غنیمت اپنی قوم کو زیادہ اور ہمیں کم دیا۔ آپ نے ایسا کیوں کیا، قربانیاں تو ہم نے دی ہیں۔۔۔؟ رسول اللہؐ نے اعتراض کرنے والے افراد کو قانع کنندہ جوابات دیئے اور انصار کو مطمئن کیا، یوں رسول اللہؐ ان پر واضح کیا کہ مال غنیمت کی یہ تقسیم الٰہی فلسفے سے ہوئی ہے نہ کہ کسی اور سبب سے۔

اگر ہم شان نزول کو مد نظر رکھتے ہوئے آیت مجیدہ کو سمجھنے کی کوشش کریں تو یہ مذکورہ آیت کا زکوۃ سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے کیونکہ مال غنیمت سے تو زکوۃ نہیں لی جاتی، خمس لیا جاتا ہے۔ ابواب فقہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ زکوۃ کو صرف نو (۹) یا پھر چند دیگر اشیاء سے لیا جائے گا لیکن اتنا تو مسلم ہے کہ غنائم جنگی کا زکوۃ سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ غنائم جنگی سے تو خمس لیا جاتا ہے۔

اسی مانند مذکورہ دونوں آیات کا باہمی رابطے کو سمجھ لیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ دونوں میں صدقات کا ایک ہی مفہوم ہے نہ کہ دو الگ الگ مفاہیم ہیں۔ یعنی آیت نمبر ۶۰: " إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ ۔۔" میں آنے

۱۔ طبرسی، فضل بن حسن، مجمع البیان، ج ۵، ص ۶۲

والے کلمہ "صدقات" اور آیت نمبر ۵۸ میں بیان ہونے والے کلمہ صدقات :"وَمِنْهُمْ مَنْ يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ۔۔" سے دو الگ الگ مفاہیم مراد نہیں ہیں بلکہ ایک ہی مفہوم مراد ہے۔

ان آیات میں، پہلے کہا جارہا ہے کہ: کچھ لوگ تقسیم صدقات کے بارے آپؐ پر اعتراض اور تنقید کرتے ہیں اور اگلی ہی آیت میں "إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ۔۔" صدقات کے مصارف (جہاں صدقات کو خرچ کرنا ہے) سے متعلق مکمل تفصیل بیان کی جارہی ہے۔آیات کا سیاق و سباق واضح کررہا ہے کہ دونوں آیات میں صدقات سے ایک ہی مفہوم مراد لیا گیا ہے۔
لہٰذا آیات کے سیاق و سباق کی وحدت اور کتب احادیث میں متعلقہ آیات کے ذیل میں بیان ہونے والے شان نزول کو دیکھنے اور پرکھنے سے ایک واضح اور منطقی نتیجہ نکلتا ہے کہ مذکورہ آیت " إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ۔۔" غنائم جنگی سے مربوط ہے اور اس آیت کا زکوۃ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔
آیت اللہ سید علی خامنہ ای مکتوب تفسیر قرآن کے علاوہ بھی اپنے خطبات اور بیانات میں قرآنی آیات کی تفسیر و تشریح کے لئے احادیث پیغمبرؐ اور روایات معصومینؑ کو بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ سن ۲۰۰۲ء میں جمہوری اسلامی ایران کے حکومتی عہدے داروں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

" طول تاریخ میں دنیا پر حاکم فاسد، ظالم، سرکش اور طاغوت مزاج حکومتوں نے ہی بشریت کو بدبخت اور نابود کیا ہے۔اس کے مدمقابل انبیائے الہیؑ بشریت کے لئے نجات دہندہ ہیں۔ لہٰذا اگر قرآن مجید کو تدبر سے پڑھا جائے تو ہمیں واضح دکھائی دے گا کہ قرآن مجید نے انبیاؑئے الہی کے آنے کے بنیادی اہداف میں سے ایک عدل کا قیام بتایا ہے۔ سورہ حدید کی آیت مجیدہ ۲۵ ملاحظہ کیجئے:"لَقَد أَرسَلنا رُسُلَنا بِالبَيِّناتِ وَأَنزَلنا مَعَهُمُ الكِتابَ وَالميزانَ لِيَقومَ النّاسُ بِالقِسطِ ۔۔"[1]

۱۔ "بتحقیق ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا ہے اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کیا ہے تاکہ لوگ عدل قائم کریں۔۔۔"

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ کتب آسمانی کا نزول اور انبیائے الٰہی کی تشریف آوری کا بنیادی ترین ہدف انسانی معاشرے میں قسط و عدل کا قیام ہے۔ یعنی فاسد حکمرانوں اور باطل نظامات کو اکھیڑ پھینکا جائے۔ امام حسینؑ کا قیام بھی اسی نوعیت کا قیام تھا۔ انھوں نے اپنے قیام کے اہداف کو اعلانیہ انداز میں بیان فرمایا ہے: " و انما خرجتُ لطلب الاصلاح في امة جدي (ص)"[1] اور اسی طرح امامؑ کا ارشاد گرامی ہے: "مَن رأی سلطاناً جائراً مستحلاً لحرام اللّٰہ او تارکاً لعهداللّٰہ مخالفاً لسنة رسول اللّٰہ فعمل فی عباداللّٰہ بالاثم والعدوان ثمّ لم یغیّر علیه بقول و لا فعل کان حقاً علی اللّٰہ أن یدخله مدخله "[2] ملاحظہ فرمائیں امامؑ کتنی صراحت سے فرمارہے ہیں کہ اگر کوئی (شخص، ادارہ، تنظیم، حکومت) ظلم و فساد کو ہوتا ہوا دیکھے اور خاموش رہے، بے تفاوتی ظاہر کرے تو اس کا ٹھکانہ اسی ظالم و فاسد کے ساتھ ہوگا۔ اس کی سرنوشت ظالم کے ساتھ ہی لکھی جائے گی۔ اسی مانند جب امامؑ فرماتے ہیں کہ میرا یہ خروج، میرا یہ قیام کسی شرارت یا پھر قتل و غارت کے لئے نہیں ہے بلکہ اہل عراق کا امامؑ کو بلانا بھی حکومت الٰہی کے قیام کے لئے تھا۔ امامؑ نے اہل عراق کی دعوت کو قبول کیا۔ یعنی امامؑ آخری لمحے تک الٰہی حکومت کے قیام کے لئے فکر مند تھے۔ امامؑ کی تمام کوششیں اسلام کی حقانیت اور طاغوتی حکومت کی سرکوبی کرنا تھا اب چاہے وہ حکومت ہاتھ میں لے کر ہو یا شہادت قبول کرکے ہو۔ امام حسینؑ جانتے تھے کہ اگر یزید جیسے ملعون حاکم کے مدمقابل خاموش رہا جائے، چپ سادھ لی جائے اور قیام نہ کیا جائے تو اسلام کس خطرے

۱۔ مجلسی، محمد باقر ابن محمد تقی، بحار الانوار، ج ۴۴ ص ۳۲۹؛ ابن شہر آشوب، المناقب، ج ۴، ص ۸۹

ثُمَّ دَعَا الْحُسَيْنُ بِدَوَاةٍ وَبَيَاضٍ وَكَتَبَ هٰذِهِ الْوَصِيَّةَ لِأَخِيهِ مُحَمَّدٍ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ هٰذَا مَا أَوْصَى بِهِ الْحُسَيْنُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ إِلَى أَخِيهِ مُحَمَّدٍ الْمَعْرُوفِ بِابْنِ الْحَنَفِيَّةِ إِنَّ الْحُسَيْنَ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَأَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ جَاءَ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِ الْحَقِّ وَأَنَّ الْجَنَّةَ وَالنَّارَ حَقٌّ وَأَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيهَا وَأَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُورِ وَإِنِّي لَمْ أَخْرُجْ أَشِراً وَلَا بَطِراً وَلَا مُفْسِداً وَلَا ظَالِماً وَإِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْإِصْلَاحِ فِي أُمَّةِ جَدِّي ص أُرِيدُ أَنْ آمُرَ بِالْمَعْرُوفِ وَأَنْهَى عَنِ الْمُنْكَرِ وَأَسِيرَ بِسِيرَةِ جَدِّي وَأَبِي عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ ع فَمَنْ قَبِلَنِي بِقَبُولِ الْحَقِّ فَاللّٰهُ أَوْلَى بِالْحَقِّ وَمَنْ رَدَّ عَلَيَّ هٰذَا أَصْبِرُ حَتَّى يَقْضِيَ اللّٰهُ بَيْنِي وَبَيْنَ الْقَوْمِ بِالْحَقِّ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ وَهٰذِهِ وَصِيَّتِي يَا أَخِي إِلَيْكَ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ. قَالَ ثُمَّ طَوَى الْحُسَيْنُ الْكِتَابَ وَخَتَمَهُ بِخَاتَمِهِ وَدَفَعَهُ إِلَى أَخِيهِ مُحَمَّدٍ ثُمَّ وَدَّعَهُ وَخَرَجَ فِي جَوْفِ اللَّيْلِ..

۲۔ بحار الانوار، علامہ مجلسی ج ۴۴ ص ۳۸۱؛ تاریخ طبری، محمد بن جریر طبری ج ۴ ص ۳۰۴؛ الکامل فی التاریخ، ابن اثیر ج ۴ ص ۴۸ نحوہ؛ مقتل ابی مخنف، ص ۸۵

مِنَ الْحُسَيْنِ بْنِ عَلِيٍّ إِلَى سُلَيْمَانَ بْنِ صُرَدٍ وَالْمُسَيَّبِ بْنِ نَجَبَةَ وَرِفَاعَةَ بْنِ شَدَّادٍ وَعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ وَالٍ وَجَمَاعَةِ الْمُؤْمِنِينَ أَمَّا بَعْدُ فَقَدْ عَلِمْتُمْ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ص قَدْ قَالَ فِي حَيَاتِهِ مَنْ رَأَى سُلْطَاناً جَائِراً مُسْتَحِلّاً لِحُرَمِ اللّٰهِ نَاكِثاً لِعَهْدِ اللّٰهِ مُخَالِفاً لِسُنَّةِ رَسُولِ اللّٰهِ يَعْمَلُ فِي عِبَادِ اللّٰهِ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ثُمَّ لَمْ يُغَيِّرْ بِقَوْلٍ وَلَا فِعْلٍ كَانَ حَقِيقاً عَلَى اللّٰهِ أَنْ يُدْخِلَهُ مُدْخَلَهُ.

میں پڑ جائے گا۔ اگر کوئی قدرت ظلم و ستم اور طغیان و سرکشی کے راستے پر چلتے ہوئے معاشرے کے تمام تر وسائل اور اختیارات کی مالک بن جائے ،اقتدار کی تمام اکائیوں پر کنٹرول حاصل کرے اور ساتھ ساتھ اس معاشرے کے اہل حق بھی اس کے خلاف آواز بلند نہ کریں، اپنا کردار ادا نہ کریں تو وہ (اہل حق) یقیناً اپنے اس عمل سے ظلم کا ساتھ دے رہے ہیں، یعنی اہل حق کا یہ رویہ ظلم کی حمایت کرنا تصور کیا جائے گا۔ (بغیر اسکے کہ وہ خود اس کا ارادہ رکھتے ہوں) نتیجتاً ایسے اہل حق کا شمار ظالمین اور مفسدین میں ہی کیا جائے گا۔۔یہ وہ عظیم گناہ تھا جس کا ارتکاب کرنے والوں میں بنی ہاشم کی بعض نامی گرامی شخصیات اور صدر اسلام کے بڑے بڑے اصحاب اور ان کی اولادیں شامل تھیں۔ امام حسینؑ ایسے حالات میں خطرے سے ڈر کر خاموشی اختیار نہیں کر سکتے تھے،ان کی خاموشی اسلام کے لئے نقصان دہ تھی، اصل اسلام ہی خطرے میں پڑ چکا تھا، لہٰذا امامؑ نے قیام کیا۔"[1]

مندرجہ بالا سطور میں سورہ حدید کی آیت نمبر ۲۵ کی تفسیر کو بیان کرتے ہوئے مفسر محترم آیت اللہ سید علی خامنہ ای نے امام حسینؑ کے دو معروف و مشہور اور معتبر ارشادات کی جانب اشارہ کیا اور انہیں کے ذریعے آیت مجیدہ سے حاصل ہونے والے اہداف و مقاصد کو بیان کیا۔

اسی مانند تفسیر سورہ تغابن میں آیت نمبر ۲ کے آخری کلمات "وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ "[2] کی وضاحت بیان کرتے ہوئے کافی سے روایت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"آیت مجیدہ میں مذکور جملہ "فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ "[3] اس امر کی جانب متوجہ کر رہا ہے کہ خداوند عالم تمہارے اعمال پر ناظر ہے۔"وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ" سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کفر و ایمان میں

۱۔اسلامی جمہوریہ ایران کے عہدے داروں سے ملاقات پر خطاب (۱۳۸۰/۱۲/۲۷ شمسی)

۲۔سورہ تغابن، آیت ۲: هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ، ترجمہ (وہی ہے جس نے تمہیں خلق کیا پھر تم میں سے بعض کافر اور بعض ایمان والے ہیں، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس پر خوب نگاہ رکھتا ہے۔)

۳۔ایضاً

بنیادی اور اساسی ترین چیز ہے دل سے اعتقاد رکھنا نہیں ہے بلکہ اعتقاد کے ساتھ ساتھ عمل بھی لازم اور واجبی امر ہے۔"**وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ**" ہمارے یہاں عمل دو نوعیت کا ہوگا یا تو عمل "مؤمنانہ" ہوگا یا پھر "کافرانہ" یعنی ایک تعداد دل سے قبول کرتی ہوگی لیکن عمل مؤمنانہ نہیں ہے بلکہ عمل ایسا نہیں ہے کہ جس پر کہا جاسکے کہ یہ انسان اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے.جی ہاں -۔ اسیا ممکن ہے دل سے مؤمن ہو مگر عمل سے کافر ہو۔اگرچہ روایات میں یہ بھی موجود ہے کہ تمام ایمان عمل ہی ہے۔[1] لیکن اسی عمل کے چند مراحل ہیں: عمل کے پہلے مرحلے کو ایمان کہا جائے گا۔ یہ انسان کے قلب کا عمل ہے۔اس مرحلے میں انسان کا عقل و شعور ایمان لاتا ہے۔ قلب کا عمل یہی ہے۔جب دل مؤمن ہوگیا تو اعضاء و جوارح تو اسی کے تابع ہوں گے۔ دل میں ایمان کا اثر ہی تو اعضاء و جوارح سے نمودار ہوتا ہے۔[2]

اشاری (باطنی) اسلوب تفسیر

لغت میں "اشارہ" کے معانی علامت اور نشان دینے کے ہوتے ہیں۔یعنی کسی قول، فعل یا نظریہ سے کسی عنوان کا انتخاب کرنا۔ یہاں تفسیری مباحث میں اشاری اسلوب تفسیر سے مراد آیات میں موجود پنہاں پیغامات کو بیان کرنا ہوتا ہے۔یعنی مفسر اس اسلوب تفسیر میں ظواہر قرآن کو سمجھتے ہوئے اسے عبور کرتا ہے اور باطن قرآن تک جا پہنچتا ہے۔

اشاری اسلوب تفسیر کی اقسام

الف: غیر صحیح اشاری اسلوب تفسیر:

۱۔کافی، ج ۲، ص ۳۴؛ امیر المؤمنین امام علیؑ فرماتے ہیں: "**لوكان الايمانُ كلاماً لم يَنزِل فيه صوم ولا صلاة ولا حلال ولا حرام**"
۲۔ تفسیر سورہ تغابن، ص ۳۲

اس اسلوب میں مفسر اپنے باطنی شہود یا پھر اپنے عرفانی نظریات کی مدد سے آیات قرآنی کی تاویل بیان کرتا ہے۔مزید یہ کہ مفسر اسی دوران قرآن مجید کے ظواہر اور استنباط کے اصول و قواعد کی بھی رعایت نہیں کرتا۔

ب: صحیح اشاری اسلوب تفسیر

پیغمبر اسلامؐ اور اہل بیتؑ کی جانب سے بعض ایسی روایات نقل ہوئی ہیں کہ جن میں ظاہر و باطن قرآن کے مفاہیم کے ساتھ ساتھ بواطن قرآنی کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔سیرت نبویؐ اور اہل بیتؑ کی تعلیمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مفسرین کی ایک تعداد نے ظواہر قرآن کے ساتھ باطن قرآن کی تفسیر کی جانب قدم بڑھایا ہے۔لیکن مفسرین اس امر کو تفسیری قواعد و ضوابط کی بنیاد پر ہی انجام دیتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ اور امیر المؤمنین امام علیؑ کے کلام میں بھی اس جانب اشارہ کیا گیا ہے۔امام سجادؑ سے ایک روایت نقل کی جاتی ہے:

" إنّ كتابَ اللهِ على أربَعةِ أشياءَ : علَى العِبارَةِ ، و الإشارَةِ ، و اللَّطائفِ ، و الحَقائقِ . فالعِبارَةُ للعَوامِّ ، و الإشارَةُ للخَواصِّ ، و اللَّطائفُ للأولياءِ ، و الحقائقُ للأنبياءِ "[1] یعنی ۔۔اللہ کی کتاب چار اوامر پر استوار ہے۔پہلا امر عبارت قرآن ہے ، دوسرا امر قرآنی اشارے ہیں، تیسرا امر لطائف قرآن ہیں اور چوتھا امر حقائق قرآن ہیں۔لہٰذا قرانی عبارات عام لوگوں کے لئے ہیں۔قرآنی اشارے خواص کے لئے ہیں۔لطائف قرآنی اولیاء کے لئے ہیں اور حقائق قرآنی انبیاء علیہم السلام کے لئے ہیں۔

کتب احادیث میں اس نوعیت کی بہت سی احادیث پیغمبر اسلامؐ سے نقل کی گئی ہیں اور معصومینؑ نے بھی انہیں تفصیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ان تمام احادیث و روایات کو دیکھ کر یہ امر ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید اپنے ظاہر

---

[1] ۔ إحسائی، محمد بن علی بن ابراہیم، عوالی اللآلی: ج ۴، ص ۱۰۴

کے ساتھ عمیق باطن رکھتا ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے اشارے اور کنایے موجود ہیں کہ جنہیں اشاری اسلوب تفسیر کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے۔

آیت اللہ سید علی خامنہ ای کا اشاری اسلوب تفسیر

مفسر بزرگوار نے اپنے تفسیری مباحث میں متعدد مقامات پر اشاری اسلوب تفسیر سے استفادہ کرتے ہوئے آیات قرآنی کو نہایت سلیس اور خوبصورت انداز معاشرے کے عام و خاص کے لئے بیان کیا ہے۔ آیت اللہ سید علی خامنہ ای سن ۱۹۹۰ میں آنے والے ماہ مبارک رمضان کے دوران خطبہ جمعہ میں قرآن کی اہمیت اور امت مسلمہ کے رویہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یہ مبارک مہینہ قرآن کی بہار کا مہینہ ہے۔ قرآن مجید سے انس، ہمارے اذہان اور فکری رجحانات کو خود اسلام اور اسلامی تعلیمات سے متعلق عمیق اور بافہم بنادیتا ہے۔ دور جدید میں اسلامی معاشرے جس بدبختی کا شکار ہیں اس کا بنیادی ترین سبب ان کا قرآن مجید سے دور ہونا ہے۔ امت مسلمہ میں وہ اقوام جو قرآن مجید سے دور ہیں ان کی زبوں حالی ہم سب کے سامنے ہے۔ حد تو یہ ہے کہ بعض معاشرے ایسے ہیں کہ ان کی زبان بھی قرآنی زبان (عربی) ہے مگر اس کے باوجود وہ قرآن مجید میں تدبر اور تفکر نہیں کرتے جس کے سبب اہل اسلام ہوتے ہوئے بھی اس غلامانہ زندگی پر مطمئن ہیں۔ قرآن مجید سورہ نسآء کی آیت نمبر ۱۴۱ میں انتہائی صراحت سے فرماتا ہے: "۔۔وَلَن يَجعَلَ اللَّهُ لِلكافِرينَ عَلَى المُؤمِنينَ سَبيلًا"[1] یعنی اللہ رب العزت نے مؤمنین کو کفار کے زیر

---

[1] ۔ سورہ مبارکہ النساء آیہ ۱۴۱
"الَّذينَ يَتَرَبَّصونَ بِكُم فَإِن كانَ لَكُم فَتحٌ مِنَ اللَّهِ قالوا أَلَم نَكُن مَعَكُم وَإِن كانَ لِلكافِرينَ نَصيبٌ قالوا أَلَم نَستَحوِذ عَلَيكُم وَنَمنَعكُم مِنَ المُؤمِنينَ ۚ فَاللَّهُ يَحكُمُ بَينَكُم يَومَ القِيامَةِ ۗ وَلَن يَجعَلَ اللَّهُ لِلكافِرينَ عَلَى المُؤمِنينَ سَبيلًا"، ترجمہ (یہ (منافق) تمہارے حالات کا انتظار کرتے ہیں کہ اگر اللہ کی طرف سے تمہیں فتح حاصل ہو تو کہتے ہیں: کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اور اگر کافروں کو کچھ کامیابی مل جائے تو (ان سے) کہتے ہیں: کیا ہم تمہارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے؟ (اس کے باوجود ہم نے تمہارے ساتھ جنگ نہ کی) اور کیا ہم نے تمہیں مؤمنوں سے بچا نہیں لیا؟ پس اللہ قیامت کے دن تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا اور اللہ ہرگز کافروں کو مؤمنوں پر غالب نہیں آنے دے گا۔)

تسلط قرار نہیں دیا۔ قاریان قرآن اس آیت کی تلاوت کرتے ہیں مگر اس پر عمل نہیں ہوتا۔امت اسلامی میں آیات قرآن پر توجہ کم ہے،تدبر کم ہےاور ان قرآنی احکامات سے دوری ہی موجودہ محکومی کی دلیل ہے۔"

اجتہادی اسلوب تفسیر

اجتہادی اسلوب تفسیر، تفسیر قرآن کا ایک ایسا اسلوب ہے جس میں مفسر منابع اصلی (جیسے خود قرآن مجید، احادیث مبارکہ، کلمات قرآن کے لغوی معانی۔۔۔) کو مد نظر رکھتے ہوئے عقل و فکر اور تدبر فی القرآن کے ذریعے آیات الٰہی کے معنی و مقصود کو استخراج کرتا ہے۔اجتہادی تفسیر میں مفسر صرف احادیث کے ذریعے آیات الٰہی کے مفاہیم کو سمجھنے کی بجائے عقل و فکر کے ذریعے آیات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اجتہادی اسلوب تفسیر ،احادیث و روایات کے ہمراہ ہی عقل و فکر سے استخراج فہم قرآن کا نام ہے۔لہٰذا اسے تفسیر بالرائے سے تشبیہ دینا سراسر ناانصافی ہے۔

اجتہادی اسلوب تفسیر کو دیگر تفسیری مناہج پر یہ فوقیت بھی حاصل ہے کہ یہ اسلوب آیات الٰہی کو سمجھنے میں اتقن اور قدیمی ترین اسلوب ہے۔اگرچہ بعض صاحبان علم، تفسیر کے اسلوب روائی (حدیثی) باقی تمام اسالیب پر ترجیح دیتے ہیں لیکن اگر ہم صدر اسلام میں بیان کی گئی تفاسیر کی جانب توجہ کریں تو وہ ہمیں اجتہادی اسلوب تفسیر کے پیرو نظر آتے ہیں۔ابن عباس، ابن مسعود، قیس ابن مسلم، مجاہد اور ان جیسے دسیوں معروف مفسرین اجتہادی اسلوب تفسیر کے ذریعے ہی تفسیر بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں۔صدر اسلام کے مفسرین احادیث و روایات کا سہارا ضرور لیتے تھے مگر آیات الٰہی کی تفسیر کا مرکز و محور تفکر و تدبر ہوا کرتا تھا۔ وہ روایت یا سماع کو فہم آیات کا ایک ذریعہ گردانتے تھے۔ تفسیر اجتہادی کے اسلوب کو دو دیگر اسالیب (تفسیر بالرائے اور تفسیر روائی) کا حد وسط کہا جاسکتا ہے۔اس اسلوب میں روایات واحادیث کو بنیادی حیثیت دی جاتی ہے لیکن صرف روایات تک محدود

نہیں رہا جاتا اور دوسری جانب سے عقل و فکر کے ذریعے قرآنی آیات میں تدبر و تفکر کرتے ہوئے فہم قرآن کو بہتر سے بہتر کیا جاتا ہے۔

صدر اسلام سے ہی اصحاب و تابعین نے تفسیری مباحث میں عقل و فکر اور تفکر کو بنیادی اور اساسی مقام دیا ہوا تھا۔ یہ بات بھی درست ہے کہ اصحاب کرام اور تابعین کا ایک گروہ صرف اور صرف احادیث کے ذریعے قرآنی آیات کو سمجھنے کے پابند تھے مگر اصحاب و تابعین کا ایک دوسرا گروہ عقل و خرد کو فہم آیات قرآنی میں بنیادی اہمیت دینے کا قائل رہا ہے۔ اسی گروہ نے عقلی اور اجتہادی تفسیر کی بنیاد ڈالی۔ ان مفسرین کی رائے یہی رہی کہ قرآن مجید جہاں بہت سے انفرادی مسائل کو زیر بحث لاتا ہے وہاں بہت سے اجتماعی اور بین الاقوامی اصول و قوانین اور معانی و مفاہیم کا حامل ہے جس کی تبیین ہر زمانے کی ضرورت ہے اور ان آیات کی تفسیر اجتہادی اسلوب کے بغیر ممکن نہیں۔

روائی اور تاریخی شواہد بھی موجود ہیں کہ نبی اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ خود بھی تفسیر قرآن میں اجتہادی اسلوب کو اپنایا کرتے تھے اور اپنے شاگردوں کو اس کی تعلیم بھی دیا کرتے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ان کے شاگرد بھی ان کی پیروی میں اس اسلوب (اجتہادی) سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ پیغمبر اسلامؐ کا ارشاد گرامی ہے: "**القرآن ذلول ذو وجوہ فاحملوہ علی احسن الوجوہ**"[1] اسی مانند امیر المؤمنین امام علیؑ دینی امور میں تعلیم و تعلم کے بارے عقل و خرد کی اہمیت سے متعلق فرماتے ہیں: "**الدین لا یصلحہ الّا العقل**"[2] اس سے بھی واضح تر امر یہ ہے کہ خود قرآن مجید متعدد مقامات پر آیات الٰہی میں غور و فکر اور تدبر و تفکر کی دعوت دیتا ہے۔ جیسا کہ سورہ مبارکہ "ص" میں بیان ہے: " **كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ** "[3] یا اس سے بھی بڑھ کر سخت

۱۔ ہندی، علاء الدین علی بن حسام، کنز العمال، ۲۴۶۹؛ مجمع البیان، ج ۱، ص ۴۰، (قرآن کے مختلف باطن ہیں، لہٰذا اسے بہترین معانی پر حمل (معانی) کرو)

۲۔ غرر الحکم و درر الکلم، ج ۱، ص ۳۵۳، (دین کی اصلاح عقل کے علاوہ نہیں ہے)

۳۔ سورہ ص، آیت ۲۹، ترجمہ (یہ ایک ایسی بابرکت کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں تدبر کریں اور صاحبان عقل اس سے نصیحت حاصل کریں۔)

لہجے میں ارشاد الٰہی ہوتا ہے کہ : "أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا "[۱]۔قرآن مجید میں متعدد مقامات پر جس انداز میں غور و تفکر کی دعوت دی گئی ہے وہ خود تفسیر آیات الٰہی میں اجتہادی اسلوب کی پہلی اور قوی ترین دلیل ہے۔اسی سبب مفسرین کی ایک تعداد آیات الٰہی کی تفسیر میں عقل و فکر کو خاص اہمیت دیتی نظر آتی ہے جسے اصطلاح میں تفسیر قرآن کا اجتہادی اسلوب کہا جاتا ہے۔

آیت اللہ سید علی خامنہ ای کا اجتہادی اسلوب تفسیر

آیت اللہ سید علی خامنہ ای بھی انہیں مفسرین میں سے ہیں کہ جو تفسیری مباحث میں اجتہادی اسلوب تفسیر کو اساسی اور بنیادی مقام دیتے ہیں۔انہوں نے اپنے تفسیری مباحث میں متعدد مرتبہ قرآن مجید اور آیات الٰہی میں تفکر وتدبر کرنے پر زور دیتے ہوئے اسے ایک قرآنی حکم قرار دیا ہے۔وہ سورہ جمعہ کی تفسیر میں ایک مقام پر آسمانی کتب کے مواد (content) کے متعلق بحث کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں:

"آسمانی کتابوں کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے،ان کا ایک حصہ عمل سے مربوط ہے تو ایک حصہ استدلال سے اور اسی مانند ایک حصہ ایمانیات اور عقائد سے مربوط ہے ---آسمانی کتابوں کا ایک بڑا حصہ عقل و شعور سے متعلق ہے،آسمانی کتابوں کا یہ حصہ بنی نوع انسان کو تعقل و تفکر پر ابھارتا ہے۔آسمانی کتابوں کی یہ آیات انسان کو حکم دیتی ہیں کہ وہ اپنے ذہن کو مختلف استدلال کے ذریعے کام میں لائے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی سورہ آل عمران میں ارشاد رب العزت ہوتا ہے:"إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ "[۲] توجہ کیجئے، یہ آیت انسان کو آسمان و زمین کی جانب متوجہ کرتی ہے۔ہم بارہا بیان کر چکے ہیں کہ آسمانی کتابوں ، انبیائے الٰہی اور بالخصوص قرآن مجید کا بشریت پر ایک عظیم احسان یہ ہے کہ انہوں نے بنی نوع انسان کو غور و

۱۔ سورہ محمد، آیت ۲۴، ترجمہ (کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا (ان کے) دلوں پر تالے لگ گئے ہیں؟)

۲۔ سورہ آل عمران، آیت ۱۹۰، ترجمہ (بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے بدلنے میں صاحبان عقل کے لئے نشانیاں ہیں۔)

فکر، تفکر وتدبر، سوچنے کا حکم دیا ہے۔ انہوں نے بنی نوع انسان کو روز مرہ کے معمولات زندگی کے متعلق بھی جستجو کی کیفیت برقرار رکھنا سکھایا ہے جس کا موازنہ کسی بھی دوسری نعمت سے نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ نعمت باقی تمام نعمتوں کا بالاتر ہے۔ بشر اپنے روزمرہ زندگی میں پائے جانے والے حوادث و واقعات کا عادی ہو جاتا ہے۔ دن کا رات میں بدل جانا اور پھر رات کے بعد دن ہو جانا، سورج کا ظاہر ہونا پھر ڈوب جانا، موسم کے بدلتے حالات یہ سب اور ان جیسے سینکڑوں فطری امور ہماری زندگی میں معمول بن چکے ہیں اسی لئے ہم بالعموم ان موضوعات پر غور و فکر نہیں کر پاتے۔ اسی سبب ان امور سے متعلق سوال پیدا نہیں ہوتا اور اگر کسی امر سے متعلق سوال پیدا نہ ہو، جستجو نہیں ہوتی اور اگر جستجو نہ ہو انسان ان امور کی گہرائی اور حقیقت کو نہیں جان سکتا۔ لیکن اگر اس کے برعکس انسان میں ان امور سے متعلق جستجو پیدا ہو جائے اور انسان کے ذہن میں سوال پیدا ہونا شروع ہو جائیں تو انسان ان کی حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔۔۔ بشریت کے ذہن میں حقائق عالم اور اس سے مربوط ہزاروں مسائل سے متعلق سوال کس نے القا کئے۔؟ یہ انبیاءؑ ہی تھے کہ جو تاریخ کے ہر موڑ پر بشر کو جستجو کا درس دیتے آئے ہیں۔۔۔ انبیائے کرامؑ انسان میں جستجو، سوال اور غور و فکر ایجاد کرتے آئے ہیں۔ یہ بشریت پر انبیائے الٰہی کا ایک عظیم احسان ہے جسے کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ آسمانی کتابوں کا ایک حصہ یہی ہے جس میں وہ انسان کو اس امر کی جانب متوجہ کرتا ہے۔ لہٰذا اسی سبب آپ قرآن مجید میں بھی دیکھتے ہیں کہ جگہ جگہ کبھی تعقل کی دعوت دی گئی ہے "۔۔لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ "[1] تو کبھی تدبر کی "أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ۔۔ "[2] "أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ "[3] اور اسی طریقے پر کبھی فہم وفراست سے کام لینے کا حکم دیا گیا ہے: "۔۔قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ

۱۔ سورہ بقرہ، آیت ۷۳، (۔۔تاکہ تم عقل سے کام لو)

۲۔ سورہ نسآء، آیت ۸۲، (کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے۔۔؟)

۳۔ سورہ مؤمنون، آیت ۶۸، (کیا انہوں نے اس کلام (قرآن مجید) پر غور نہیں کیا۔۔؟)

لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ "[۱]۔ یہاں توجہ طلب امر یہ ہے کہ قرآن مجید ان امور (تعقل، تدبر، تفقہ۔۔۔) کا حکم دے رہا ہے، (یعنی ان امور پر عمل کرنا واجب ہے)۔۔۔"[۲]

مفسر بزرگوار نے اپنے تفسیری مباحث میں متعدد مقامات پر اجتہادی اسلوب تفسیر سے استفادہ کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ استنباطِ معارف قرآن اور فہم آیات کے سلسلے میں اس اسلوب کو کثرت سے استعمال کرتے ہیں، ہم یہاں پر چند مثالوں کا ذکر کئے دیتے ہیں:

"سورہ توبہ کی آیت نمبر ۳۸: ﴿۔۔فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ﴾[۳] کی تفسیر کے ذیل میں مفسر بزرگوار بیان کرتے ہیں کہ: بیشتر مفسرین بالعموم آیت کے معانی میں دنیاوی متاع کو اخروی متاع کے مدمقابل ناچیز سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ دنیا آخرت کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ یعنی یہ مفسرین " فِي الْآخِرَةِ "کا" فِي جنب الْآخِرَةِ " معانی کرتے ہیں۔ لیکن آیت مجیدہ میں تفکر کرنے سے سمجھ آتا ہے کہ یہاں متاع آخرت مراد ہے۔

مفسر بزرگوار اسی آیت کی وضاحت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اس کی وضاحت یوں بیان کی جا سکتی ہے کہ انسان کا اس شکل و صوت، قد و قامت اور خاص صلاحیات اور قوت و طاقت کے ساتھ اس دنیا میں آنے کا بنیادی ترین مقصد یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں اپنی توان و استعداد کے مطابق ممکنہ کمالات کو حاصل کرے، یعنی وہ اپنی صلاحیات کو ایک ایسے مرحلے میں لے جائے کہ اسے مطلوبہ کمال حاصل ہو جائے۔ انسان کی تمام تر مادی زندگی اسی ہدف (کمال انسانیت) کے حصول کے لئے خرچ ہونا چاہئے۔ اسے کوشش کرنا ہو گی کہ اپنی مختصر سی زندگی میں کمال واقعی تک پہنچ سکے۔ اب اگر انسان اس مرحلے تک پہنچ جائے تو اس کمال سے بہرہ مند ہونے کا مقام یہ دنیا نہیں ہے بلکہ آخرت ہے، انسان اس دنیا میں کمال کا حصول

۱۔ سورہ انعام، آیت ۹۸۔ (۔۔ہم نے صاحبان فہم و فراست کے لئے آیات کو کھول کر بیان کر دیا ہے۔)
۲۔ خامنہ ای، آیت اللہ سید علی، تفسیر سورہ جمعہ، ص ۹۳
۳۔ ترجمہ (دنیاوی زندگی کی متاع تو آخرت کے مقابلے میں بہت کم ہے۔)

آخرت کے لئے کرتا ہے۔انسان مرنے سے پہلے اس کمال تک پہنچتا ہے کہ اخروی زندگی میں اس سے بہرہ مند ہوسکے۔(اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ اَلْآخِرَةِ)[1] یعنی آپ اس جسم کو آمادہ اور پختہ کرتے ہیں کہ جب آپ وہاں پہنچیں تو آپ کامل ہوں۔۔۔"[2]

۱۔ رسول ختمی مرتبتؐ کی حدیث مبارکہ، عوالی اللئالی، ج۱، ص۲۶۷، ترجمہ (دنیا آخرت کی کھیتی ہے)
۲۔ تفسیر سورہ توبہ، ص۲۶۱

نتیجہ

آیت اللہ سید علی خامنہ ای کے تمام تر تفسیری مباحث کے تفصیلی مطالعے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مفسر کا تفسیری اسلوب ، ایک اجتہادی اسلوب ہے۔ وہ اسی ذیل میں قرآن بہ قرآن اور روائی اسالیب سے بہت مستفید ہوتے ہیں۔اسی مانند انہوں نے بہت سے مقامات پر اشاری اسلوب تفسیر کے ذریعے تفسیر بیان کی ہے۔وہ اپنے تفسیری مباحث میں اجتہادی اسلوب تفسیر کے مطابق اللہ رب العزت کی دی ہوئی عقل اور تفکراتی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے قرآنی آیات کے معانی و مفاہیم کا ادراک اور ان کے حقیقی اہداف و مقاصد تک رسائی حاصل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مصادر

۱۔ قرآن مجید

۲۔ نہج البلاغہ

۳۔ شرح نہج البلاغہ ، خطبات آیت اللہ سید علی خامنہ ای، ناشر : دفتر حفظ و نشر آثار آیت اللہ سید علی خامنہ ای ، انتشارات انقلاب اسلامی، محل نشر: تھران۔ایران، سال نشر:۱۳۹۹ ھ۔ش

۴۔ تفسیر سورہ توبہ، آیت اللہ سید علی خامنہ ای ، ناشر : دفتر حفظ و نشر آثار آیت اللہ سید علی خامنہ ای ، انتشارات انقلاب اسلامی، محل نشر: تھران۔ایران، سال نشر:۱۳۹۶ ھ۔ش

۵۔ تفسیر سورہ ممتحنہ ، آیت اللہ سید علی خامنہ ای، ناشر : دفتر حفظ و نشر آثار آیت اللہ سید علی خامنہ ای ، انتشارات انقلاب اسلامی، محل نشر: تھران۔ایران، سال نشر:۱۳۹۹ ھ۔ش

۶۔ تفسیر سورہ جمعہ ، آیت اللہ سید علی خامنہ ای ، ناشر : دفتر حفظ و نشر آثار آیت اللہ سید علی خامنہ ای ، انتشارات انقلاب اسلامی، محل نشر: تھران۔ایران، سال نشر:۱۴۰۱ ھ۔ش

۷۔ تفسیر سورہ تغابن، آیت اللہ سید علی خامنہ ای، ناشر: دفتر حفظ و نشر آثار آیت اللہ سید علی خامنہ ای، انتشارات انقلاب اسلامی، محل نشر: تھران۔ایران، سال نشر: ۱۳۹۹ ھ۔ش

۸۔ طرح کلی اندیشہ اسلامی در قرآن، آیت اللہ سید علی خامنہ ای، مؤسسہ ایمان جھادی/چاپ اول ۱۳۹۲ھ۔ش

۹۔ الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور، المؤلف: جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر سیوطی (المتوفی: ۹۱۱ ھ) ناشر: انتشارات اسلامیہ و جعفری محل نشر: تھران۔ایران، سال نشر: ۱۳۷۷ھ

۱۰۔ تفسیر طبری (تاریخ الرُسُلِ والاُمَمِ والمُلوکِ) المؤلف: محمد ابن جریر طبری (المتوفی: ۳۱۰ھ) ناشر: دار الکتب العلمیہ/انتشارات سروش، تھران۔ایران، چاپ دوم، تہران، ۱۳۷۸ش

۱۱۔ مجمع البیان، المؤلف: فضل بن حسن طبرسی (المتوفی: ۵۴۸ ھ) ناشر: دار احیاء التراث العربی محل نشر: بیروت۔لبنان، سال نشر: ۱۳۷۹ ھ

۱۲۔ تفسیر المیزان، المؤلف: علامہ سید محمد حسین طباطبائی (المتوفی: ۱۴۰۲ ھ) ناشر: دار الکتب الاسلامیہ، محل نشر: تھران۔ایران، سال نشر: ۱۳۷۵ قمری

۱۳۔ بحار الانوار، محمد باقر ابن محمد تقی مجلسی المعروف علامہ مجلسی (المتوفی: ۱۱۱۰ھ)، ناشر: دار الکتب الاسلامیۃ محل نشر: قم۔ایران، سال نشر: ۱۴۰۳ھ

۱۴۔ مستدرک الوسائل، المؤلف: میرزا حسین نوری المعروف محدث نوری (المتوفی: ۱۳۲۰ھ)، ناشر: مؤسسہ آل البیت لاحیاء التراث، محل نشر: قم۔ایران، سال نشر: ۱۴۰۸ھ

۱۵۔ عوالی اللآلی، المؤلف: شیخ محمد بن علی بن ابراہیم إحسائی المعروف ابن ابی جمہور، ناشر: مطبعۃ سید الشہداء، محل نشر: قم۔ایران، سال نشر: ۱۴۰۳ھ

۱۶۔ کنزل العمال فی سنن الاقوال و الافعال، المؤلف: علاء الدین علی بن حسام المعروف متقی ہندی (م ۹۷۵ یا ۹۷۷ھ) ناشر: مؤسسۃ الرسالۃ، محل نشر: بیروت۔لبنان، سال نشر: ۱۴۰۹ ھ

۱۷۔ : غرر الحکم و درر الکلم مجموعہ من کلمات و حکم الامام علی (ع) ، المؤلف: عبدالواحد الامدی التمیمی، ناشر: مرکز تحقیقات دار الحدیث، سال نشر: ۱۳۹۵ ھ۔ش

۱۸۔ مسند الإمام إحمد بن حنبل ، المؤلف: احمد بن محمد ابن حنبل (۲۴۱ھ) ناشر: دار المنہاج، محل نشر: جدہ۔ سعودیہ، سال نشر: ۱۴۲۰ھ

۱۹۔ سنن ابی داوٗد، المؤلف: ابو داود، سلیمان بن اشعث اَزدی سجستانی (المتوفی: ۲۷۵ ھ) ناشر: دار ابن حزم، محل نشر: بیروت۔ لبنان، سال نشر: ۱۴۱۸ ھ

۲۰۔ مَناقِبُ آلِ اِبی طالب، المؤلف: محمد بن علی بن شہر آشوب (المتوفی: ۵۸۸ ھ) ناشر: المکتبۃ الحیدریۃ، محل نشر: قم۔ ایران، سال نشر: ۱۳۷۶ھ

آیہ مودت تفسیر نمونہ اور تفسیر روح المعانی کی نگاہ میں

محمد نواز[1]

خلاصہ

قرآن کریم میں اہلیبت علیہم السلام کی شان میں نازل ہونے والی آیات کو عام طور پر آیات ولایت سے تعبیر کیا جاتاہے اور ان میں سے ایک مشہور آیت ،آیہ مودت ہے جس کے بارے میں اہلسنت اور شیعہ علماء کا عمومی اعتقاد یہ ہے کہ یہ آیت اہلبیت علیہم السلام کی شان میں نازل ہوئی اور اس مودت کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کے اجر کے طور پر قرار دیا گیا ہے۔اس مختصر تحریر میں ہم نے اس آیت کے کی تفسیر کے بارے میں مفسرین کے عام رجحان جس میں انہوں نے اس کی چار تفسیریں بیان کی ہیں انہیں بیان کرنے کے بعد دنیائے اسلام کے دو مشہور مفسرین کی آراء کو قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ آیت کی تفسیر کے بارے میں روائی تفسیر کا بھی مختصر جائزہ لیا جائے اور جناب آلوسی کے اس آیت کے بارے میں موجود اعتراض کا بھی جواب دیا جائے۔

بنیادی کلمات: اہلبیت، مودت، تفسیر نمونہ، تفسیر روح المعانی، تفسیری روایات

---

[1] ۔ایم۔ فل تفسیر وعلوم قرآن المصطفیٰ اوپن یونیورسٹی

تفسیر کا لغوی معنی

امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں فرماتے ہیں کہ تفسیر ہم معنی ہے الفسر کا، مگر اس میں مبالغہ کے معنی پائے جاتے ہیں تفسیر کا لفظ کبھی تو مفرد اور غریب الفاظ کی تشریح اور وضاحت پر بولا جاتا ہے اور کبھی خاص کر تاویل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اسی طرح مراد متکلم اور موضوع کو کشف کرنا بھی تفسیر کے لغوی معنی ہیں۔

تفسیر کا اصطلاحی معنی

صاحب تفسیر المیزان علامہ طباطبائی نے تفسیر کا اصطلاحی معنی کچھ یوں بیان فرمایا ہے کہ تفسیر سے مراد آیات کے معانی اور ان کے مقاصد کو بیان کرنا ہے اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر کا اصطلاحی معنی اس کے لغوی معنی کے مترادف نہیں ہے جس کا مقصد صرف مبہم الفاظ کے ظاہری معنی کو تلاش کرنا ہے بلکہ یہاں مراد متکلم کے مقصد کو تلاش کرنا ہے اس لئے تفسیر صرف انہی موارد پر صدق کرتی ہے جہاں کلام میں کسی قسم کی پیچیدگی پائی جاتی ہو یا کچھ چھپا ہو جسے تفسیر کے مراحل سے گزار کر حل یا تلاش کیا جائے گا۔

آیات اور روایات کی ادلہ

قرآن مجید کے نزول کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ص کو آیات کی تشریح و تفسیر کا حکم دیا گیا جیسے کہ سورہ نحل کی آیت نمبر ۴۴ میں اللہ کا ارشاد ہے

وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ

اور (اے رسول) آپ پر بھی ہم نے ذکر اس لیے نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کو وہ باتیں کھول کر بتا دیں جو ان کے لیے نازل کی گئی ہیں اور شاید وہ (ان میں) غور کریں۔

رسول اللہ ص نے بھی اس کار رسالت کو بخوبی انجام دیا اور وہ کلیات جو قرآن کریم نے بیان کر دیئے ان کی جزئیات کو اپنے پیروکاروں کے لئے بیان کیا اور عملا انجام دے کر مراد متکلم کو واضح کر دیا تھا جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ کے بارے میں قرآنی آیات نے کلی احکام بیان کیے ہیں جن کی تفسیر آپ ص نے بیان فرمائی۔

اسی طرح امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں

پیغمبر ص کی جانب جب نماز کی آیات نازل ہوئی تو ان میں پروردگار نے تین چار رکعت پڑھنے کا حکم نہیں بتایا یہاں تک کہ خود نبی ص نے ان کی تفسیر بیان فرمائی اسی طرح جب زکوۃ کی آیات نازل ہوئی تو ان میں بھی ذکر نہیں کیا گیا تھا کہ ہر ۴۰ درہم پر ادرہم زکوۃ واجب ہے بلکہ اس کی تفسیر بھی رسول اللہ ص نے بیان فرمائی۔

مذکورہ بالا آیت اور روایت کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تفسیر کا آغاز نزول قرآن مجید کے ساتھ ہی شروع ہوا اصحاب رسول اللہ ص آیات کے حوالے سے سوال کرتے تھے اور آپ ص ان کی تفسیر بیان فرماتے تھے

آیت مودت تفسیر نمونہ اور تفسیر آلوسی (روح المعانی کی نگاہ میں

ذٰلِکَ الَّذِیْ یُبَشِّرُ اللّٰہُ عِبَادَہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی ؕ وَ مَنْ یَّقْتَرِفْ حَسَنَۃً نَّزِدْ لَہٗ فِیْہَا حُسْنًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ شَکُوْرٌ۔[1]

⊙ شان نزول

تفسیر مجمع البیان میں اس سورت کی ۲۳ ویں تا ۲۶ ویں آیت کی شان نزول پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں مروی ہے جس کا خلاصہ اس طرح ہے:

۱۔ سورہ شوری آیت ۲۳

"جب پیغمبر اسلام ص مدینہ تشریف لا چکے اور اسلام کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں تو انصار نے کہا کہ ہم رسول اللہ کی خدمت میں جا کر عرض کرتے ہیں کہ اگر آپ کو مالی مشکلات در پیش ہیں تو ہمارے یہ مال غیر مشروط طور پر آپ ص کی خدمت میں حاضر ہیں۔ جب آنحضرت ص نے ان کی باتیں سُن لیں تو یہ آیت نازل ہوئی "قُلْ لا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْراً إِلاَّ الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبى" کہہ دیجئے کہ میں تم سے اپنی رسالت کا اجر نہیں مانگتا مگر یہ کہ میرے نزدیکیوں سے محبت کرو تو آنحضرت ص نے یہ آیت انہیں سنائی اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ میرے بعد میرے قریبیوں سے محبت کرنا یہ سُن کر وہ خوشی خوشی وہاں سے واپس آ گئے، لیکن منافقین نے یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ یہ بات (معاذاللہ) رسول نے از خود کہی ہے اور خدا پر جھوٹ باندھا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے بعد ہمیں اپنے رشتہ داروں کے آگے ذلیل و رسوا کرے۔

چنانچہ اس کے بعد اگلی آیت نازل ہوئی "أَمْ يَقُولُونَ افْتَرى عَلَى اللَّهِ كَذِباً

جو ان لوگوں کا جواب تھا پیغمبر اسلام ص نے کسی کو بھیج کر یہ آیت انہیں سنائی. کچھ لوگ نادم ہو کر رونے لگے اور سخت پریشان ہوئے آخر کار اس کے بعد والی آیت نازل ہوئی جس میں کہا گیا ہے "وَ هُوَ الَّذی يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبادِهِ وَ يَعْفُوا عَنِ السَّيِّئاتِ وَ يَعْلَمُ ما تَفْعَلُونَ

آنحضرت ص نے پھر کسی کو بھیج کر یہ آیت ان تک پہنچائی اور انہیں خوشخبری دی کہ ان کی خالص توبہ قبول بارگاہ ہو چکی ہے۔[1]

⊙ مودت فی القربی کی وضاحت

اس جملے کے بارے میں مفسرین نے لمبی چوڑی گفتگو اور خوب بحث کی ہے اور جب ہم خالی الذہن ہو کر ان کے پہلے سے طے شدہ فیصلے کے تحت بیان کردہ تفاسیر کی طرف نگاہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ مختلف عوامل

۱۔ مجمع البیان جلد ۹، ص ۲۹

اور اسباب کی وجہ سے آیت کے اصلی مفہوم سے ہٹ گئے ہیں اور انہوں نے ایسے احتمالات کو اپنایا ہے جو نہ تو آیت کے مفہوم سے مطابقت رکھتے ہیں نہ شان نزول سے اور نہ ہی دوسرے تاریخی اور روایاتی قرائن سے ۔

اس سلسلے میں تقریبا چار مشہور تفسیریں بیان ہوئی ہیں :

۱ ۔ جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ ذوی القربی سے مراد پیغمبر اسلام ص کے اہل بیت ہیں اور ان کی محبت ائمہ معصومین علیہم السلام کی امامت اور رہبری کو تسلیم کرنے کا ایک ذریعہ اور فریضے کی ادائگی کی ضمانت ہے۔

اس معنی کو بہت سے قدیمی مفسرین اور تمام شیعہ مفسرین نے اپنایا ہے . شیعہ ، سنی دونوں کی طرف سے اس بار ے میں بہت سی روایات منقول ہوئی ہیں جن کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے ۔

۲ ۔ دوسری تفسیر کے مطابق مراد یہ ہے کہ رسالت کا اجر یہی ہے کہ تم ان چیزوں کو دوست رکھو جو تمہیں " خدا کے قرب " کی دعوت دیتی ہیں۔

اس تفسیر کو بعض اہلسنت مفسرین نے اپنایا ہے جو کسی بھی لحاظ سے آیت کے ظاہر ی مفہوم سے ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ میں تم سے یہ چاہتا ہوں کہ تم خدا کی اطاعت کو دوست رکھو اور اس کی محبت کو دل میں جگہ دو، جبکہ کہنا یہ چاہیے تھا کہ میں تم سے خدا کی اطاعت کو چاہتا ہوں (نہ کہ اطاعت الٰہی کی محبت)

اس کے علاوہ آیت کے مخاطب افراد میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو خدا کا قرب نہ چاہتا ہو، حتیٰ کہ مشرکین بھی اس بات کے خواہش مند تھے کہ خدا سے نزدیک ہوں اور اصولی طور پر وہ بتوں کی پرستش کو اسی بات کا ذریعہ سمجھتے تھے ۔

۳ ۔ تیسری تفسیر کے مطابق مراد یہ ہے کہ تم اجر رسالت کے طور پر اپنے قریبی رشتہ داروں کو دوست رکھو اور صلہ رحمی بجالاؤ۔

اس تفسیر میں رسالت اور اجر رسالت کے درمیان کوئی مناسبت نظر نہیں آتی کیونکہ اپنے رشتہ داروں سے دوستی کرنے سے پیغمبر اسلام ص کی کونسی خدمت ہو سکتی ہے ؟ اور پھر یہ دوستی کس طرح اجر رسالت قرار پا سکتی ہے ؟

۴ ۔ چوتھی تفسیر کے مطابق مراد یہ ہے کہ تم سے جو میری قرابت ہے اس کی حفاظت کرو اور اسے محفوظ رکھو. یہی میری رسالت کا اجر ہے. چونکہ میرا تمہارے اکثر قبائل سے رشتہ ہے لہٰذا مجھے تکلیف نہ پہنچایا کرو کیونکہ آنحضرت کا نسبی لحاظ سے قریش کے قبائل سے رشتہ تھا اور سببی (ازدواجی) لحاظ سے بہت سے قبائل سے تعلق تھا نیز مادری لحاظ سے مدینہ میں بنی نجار کے متعدد لوگوں سے اور رضاعی ماں کے لحاظ سے قبیلہ بنی سعد سے آپ ص کا رشتہ تھا۔

یہ تعبیر تمام معنوں میں سے بدترین معنی ہے جو آیت کے لیے کیا جاتا ہے کیونکہ اجر رسالت کا تقاضا ان لوگوں سے کیا جاتا ہے جو آپ ص کی رسالت کو قبول کر چکے ہیں جب یہ لوگ آپ کی رسالت کو قبول کر چکے ہیں تو پھر ان سے اس قسم کی خواہش کا اظہار غیر ضروری معلوم ہوتا ہے. یہ لوگ آنحضرت کا بحیثیت رسول اللہ احترام کیا کرتے تھے. پھر کیا ضرورت تھی کہ وہ آپ ص کا بحیثیت نسبی یا سببی رشتہ دار کے احترام کریں، کیونکہ رسالت کی وجہ سے کیا جانے والا احترام دوسرے تمام اسباب و وجوہات سے بالاتر ہوتا ہے. درحقیقت اس تفسیر کا شمار بہت بڑی غلطیوں میں سے ہوتا ہے جو بعض مفسرین سے سرزد ہوئی ہے اور اس نے آیت کے مفہوم کو مکمل طور پر مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔

قرآن مجید کی بہت سی آیات میں ہم پڑھتے ہیں کہ: انبیاء کرام فرماتے تھے

وماسئلکم علیه من اجر ان اجری الاّ علی رب العالمین

دعوت رسالت کے بدلے ہم تم سے کوئی اجر نہیں مانگتے، ہمارا اجر تو صرف پروردگار عالم کے پاس ہے۔[1]

اور خود پیغمبر اکرم ص کی ذات کے بارے میں بھی مختلف تعبیریں دیکھی جا سکتی ہیں. کہیں ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ ما سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ إِنْ أَجْرِيَ إِلاَّ عَلَى اللَّه

۱۔ (سورہ شعراء آیت ۱۸۰)

کہہ دے میں جو بھی اجر رسالت تم سے طلب کیا ہے وہ صرف تمہارے ہی فائدہ کے لیے ہے اور میرا اجر تو صرف خدا کی ذات پر ہے۔(سورہ سبا آیت ۴۷) اسی طرح ایک اور آیت:

قُلْ ما أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَ ما أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ

کہہ دے: میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا اور نہ ہی تم پر کوئی بوجھ ڈالتا ہوں۔[1]

جب ہم ان تینوں آیات کو زیر بحث آیت کے ساتھ ملا کر دیکھتے ہیں تو نتیجہ نکالنا آسان ہو جاتا ہے ایک مقام پر تو اجر اور اجرت کی بالکل نفی کی گئی ہے۔

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں میں اجر رسالت صرف ان لوگوں سے مانگتا ہوں جو خدا کی راہ کو اپناتے ہیں۔

اور زیر نظر آیات میں فرماتے ہیں: میرے قریبیوں سے مودت ہی میری رسالت کا اجر ہے. یعنی:

میں نے تم سے ایسا اجر رسالت طلب کیا ہے کہ جس کی یہ خصوصیات ہیں کہ یہ بالکل ایسی چیز نہیں ہے جس کا فائدہ مجھے پہنچے، بلکہ اس کا سو فیصد فائدہ خود تمہیں ہی ملے گا اور یہ ایسی چیز ہے جو خدا تک پہنچنے کے لیے تمہاری راہ ہموار کرتی ہے۔

اس لحاظ سے کیا اس کا اس کے علاوہ کوئی مفہوم ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ ص کے مکتب کے راستے کو ان ہادیان الٰہی اور آپ ص کے معصوم جانشینوں کے ذریعے تسلسل جائے کہ جو تمام تر آپ ص کے خاندان میں سے ہوں. اور چونکہ مودت کا مسئلہ اس تسلسل اور رابطے بنیاد ہے لہٰذا اس آیت میں صراحت اور وضاحت کے ساتھ اس کا ذکر ہوا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی آیت "مودت فی القربیٰ" کے علاوہ قرآن مجید میں اور پندرہ مقامات پر "القربیٰ" کا لفظ استعمال ہوا ہے. جو ہر جگہ پر قریبیوں اور نزدیکیوں کے معنی میں ہے. پھر معلوم نہیں کہ بعض لوگ اس بات پر

۱۔(سورہ ص/۸۶).

کیوں اصرار کرتے ہیں کہ صرف اسی آیت میں "قربٰی" کو "مودت الی اللہ'' کے معنی میں منحصر کر دیا جائے اور اس کے واضح اور ظاہر معنی کو جو کہ قرآن میں ہر جگہ استعمال ہوا ہے، صرف نظر کر دیا جائے۔

⊙ مودت فی القربٰی روایات کی نظر میں

مندرجہ بالا آیت کی اس تفسیر پر شاہد ناطق وہ بہت سی روایات ہیں جو شیعہ اور سنی کتب میں خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زبان نقل ہوئی ہیں اور پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ "قربٰی" سے مراد پیغمبر اسلام ص کے نزدیکی اور مخصوص لوگ ہیں. نمونے کے طور پر:

۱۔ احمد نے "فضائل الصحابہ" میں اسناد کے ساتھ سعید بن جبیر سے اور انہوں نے عامر سے یوں روایت نقل کی ہے:

لما نزلت قل لا اسئلکم علیه اجراً الا المودة فی القربیٰ، قالوا: یارسول الله! من قرابتک؟ من هٰؤلاء الذین وجبت علینا مودّتهم؟ قال: علی و فاطمة وابناهما (علیهم السلام) وقالها ثلاثاً۔

جب آیت "قُلْ لا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْراً إِلاَّ الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبى" نازل ہوئی تو اصحاب نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کے وہ نزدیکی کون لوگ ہیں کہ جن کی مودت ہم پر واجب ہوئی ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا علی، فاطمہ اور اُن کے دو بیٹے ہیں۔

اور اس بات کو آپ نے تین مرتبہ دہرایا۔[1]

۱۔ "احقاق الحق" جلد ۳، ص د ۲، ص نیز قرطبیّ نے بھی اسی روایت کو اسی آیت کے ذیل میں درج کیا ہے. ملاحظہ ہو تفسیر قرطبیّ جلد ۸، ص ۵۸۴۳۔

۲۔ "مستدرک الصحیحین" میں امام علی بن الحسین (زین العابدین) علیہ السلام سے منقول ہے کہ امیر المؤمنین علی بن ابن ابی طالب علیہ السلام کی شہادت کے بعد امام حسن علیہ السلام نے لوگوں سے جو خطاب فرمایا اس کاایک حصّہ یہ بھی ہے:

انامن اهل البيت الذين افترض الله مودّتهم على كل مسلم فقال تبارك وتعالىٰ لنبيه (ص) قل لا اسئلكم عليه اجراً الاّ المودة فى القربىٰ ومن يقترف حسنة نزدله فيها حسناً فاقتراف الحسنة مودتنا اهل البيت میں اس خاندان میں سے ہوں خدا نے جس کی مودت ہر مسلمان پر فرض کردی ہے اوراپنے رسول ص سے فرمایا ہے "قُلْ لا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجراً إِلاَّ الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبى---..." اور نیکی کمانے سے خدا کی مراد ہم اہلبیت کی مودت ہے۔[1]

۳۔ "سیوطی" نے "درمنثور" میں اسی آیت کے ذیل میں مجاہد سے،انہوں نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ "قُلْ لا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجراً إِلاَّ الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبى" کی تفسیر میں رسول اللہ ص نے فرمایا:

ان تحفظو فى فى اهل بيتى وتودوهم بى

مراد یہ ہے کہ تم میرے حق کی میرے اہلبیت علیہم السلام کے بارے میں حفاظت کرواور میری وجہ سے ان سے محبت کرو۔[2]

۴۔ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں اپنی اسناد کے ساتھ سعید بن جبیر سے اور دوسری اسناد کے ساتھ عمر بن شعیب سے نقل کیاہے کہ اس آیت سے مراد :

۱۔ "متدرک الصحیحین" جلد ۳، ص ۱۷۲محب الدین طبرسی نے بھی اسی حدیث کواپنی کتاب "ذخائر العقبیٰ" کے ص ۱۳۷ میں اورابن حجر نے اپنی کتاب "صواعق محرقہ" میں نقل کیاہے ملاحظہ ہو ص ۱۰۱۔

۲۔ تفسیر درمنثور جلد ۶ صفحہ ۷ اسی آیت کے ذیل میں

هي قربیٰ رسول الله

رسول خدا کے نزدیکی افراد ہی[1]

۵۔ مشہور مفسر مرحوم طبرسی رحمتہ اللہ علیہ نے حاکم حسکانی کی کتاب " شواھد التنزیل " سے ایک روایت نقل کی ہے. حاکم کا شمار اہل سنت کے مشہور مفسرین اور محدثین میں ہوتا ہے. انہوں نے " ابوامامہ باہلی " سے نقل کیا ہے کہ پیغمبر اسلام ص فرماتے ہیں :

ان الله خلق الانبیاء من اشجار شتی ،وانا وعلی من شجرة واحدة ،فانا اصلها ،وعلی فرعها ،وفاطمة لقاحها ، والحسن الحسین ثمارها،واشیا عنا اوراقها۔ ... یہاں تک کہ فرمایا ... لوان عبداً عبد الله بین الصفاوالمروة الف عام ، ثم الف عام ، ثم الف عام ،حتی یصیر کالشن البالی ،ثم لم یدرک محبتناکبه الله علی منخریه فی النار،ثم تلا : قل لا اسئلکم علیه اجراً

خدانے تمام انبیاء کو مختلف درختوں سے پیدا کیا ہے لیکن مجھے اور علی کو ایک ہی درخت سے پیدا کیا جس کی جڑ میں ہوں، شاخ علی ، فاطمہ اس کی افزائش کا ذریعہ ہیں، حسن اور حسین اس کے میوے ہیں اور ہمارے شیعہ اس کے پتے ہیں ... پھر فرمایا ... اگر کوئی شخص صفا اور مروہ کے درمیان ہزار سال تک خدا کی عبادت کرے ، پھر ہزار سال اور ، پھر ہزار اور اس کی عبادت کرے اور اتنی عبادت کرے کہ سوکھ کر پرانی مشک کے مانند ہو جائے لیکن ہماری محبت اس کے دل میں نہ ہو تو خدا اسے منہ کے بل جہنم میں ڈالے گا . پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فر مائی "قُلْ لا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْراً إِلاَّ الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبى) "[2]

۱۔ تفسیر طبری جلد ۲۵، ص ۱۶، ۱۷

۲۔ تفسیر مجمع البیان، جلد ۹، ص ۲۹۔

۶ ۔ فخر رازی نے صاحب کشاف سے یوں نقل کیا ہے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگوں نے عرض کی، یارسول اللہ ! آپ کے قریبی رشتہ دار کون ہیں جن کی محبت ہم پر فرض ہوئی تو آنحضرت ص نے ارشاد فرمایا: وہ علی و فاطمہ اور ان کے دو فرزند ہیں۔

پس معلوم ہوا یہ چار بزرگوار ہستیاں پیغمبر اسلام ص کی ذوی القربی ہیں اور جب یہ ثابت ہو گیا تو پھر ضروری ہے کہ اُن کا انتہائی احترام کیا جائے۔

فخر الدین رازی مزید کہتے ہیں کہ اس مسئلے پر مختلف دلائل دلالت کرتے ہیں

۱ ۔ " إِلاَّ الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبى "کا جملہ کہ جس کا طرز استدلال بیان ہو چکا ہے۔

۲۔اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ ص کو حضرت فاطمہ ع سے محبت تھی اور ان کے بارے میں فرمایا" **فاطمة بضعة منی یوذینی مایوذیها** " (فاطمہ میرے بدن کا ٹکڑا ہے جو چیز اسے تکلیف دے گی وہ مجھے تکلیف دے گی) اور رسول خدا ص کی متواتر حدیثوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے آپ ص علی، فاطمہ حسن اور حسین ع سے محبت فرماتے تھے ،اور جب یہ بات ثابت ہو گئی تو ان کی محبت تمام امت پر واجب ہے۔

۳۔ "آل "کے لیے دعا ایک عظیم اعزاز ہے لہٰذا یہ دعا تشہد کے اختتام پر موجود ہے " **اللهم صلی علیٰ محمد و علی اٰل محمد، وارحم محمداً واٰل محمد** "اور اس قسم کی عظمت اور احترام آل کے علاوہ کسی اور کے بار ے میں نظر نہیں آتا لہٰذا ان سب دلائل کی روشنی میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ آل محمد ص کی محبت واجب ہے۔

آخر الامر فخر الدین رازی اپنی گفتگو کو امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے ان مشہور اشعار پر ختم کرتے ہیں۔

یاراکبا قف بالمح من منی ... واهتف بساکن خیفها والناهض

سحراً اذا فاض الحجیج الی منی ... فیضا کمانظر الف الفائض

ان کان رفضا حب آل محمد ... فلیشھد الثقلان انی رافضی

اے حج کے لیے جانے والے سوار ! جہاں پر منی کے نزدیک رمی جمرات کے لیے کنکریاں اکٹھا کرتے ہیں اور جو خانہ خدا کے زائرین کا عظیم اجتماعی مرکز ہے تو وہاں پر ٹھہر جا اور ان لوگوں کو آواز دے جو مسجد خیف میں مصروف عبادت ہیں یا چل رہے ہیں۔

اس وقت پکار جب بوقت سحر حجاج مشعر الحرام سے منیٰ کی جانب چل پڑتے ہیں اور عظیم اور ٹھاٹھیں مارتے دریا کے مانند سرزمین منیٰ میں داخل ہوتے ہیں۔

ہاں تو بآواز بلند کہہ دے کہ اگر آل محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی محبت کا نام رفض (رافضی ہونا) ہے تو تمام جن وانس گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں۔[1]

مندرجہ بالا احادیث کے علاوہ اسلامی کتابوں میں اور بھی بہت سی احادیث موجود ہیں لیکن ہم اختصار اور تفسیری پہلوؤں پر قناعت کرتے ہیں اور مندرجہ بالا احادیث پر اکتفا کرتے ہیں، لیکن اس نکتے کو بیان کرنا مناسب سمجھتے ہیں کہ علم کلام کی بعض کتابوں مثلاً "احقاق الحق" اور اس کی مبسوط شرح میں "قُلْ لا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْراً إِلاَّ الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبى" کی تفسیر میں مذکورہ بالا مشہور حدیث اہل سنّت کی پچاس سے زائد کتابوں سے نقل کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت کس قدر مشہور و معروف ہے. البتہ کتب شیعہ میں بھی یہ حدیث اہل بیت کے حوالے سے بہت سی کتب حدیث میں نقل کی گئی ہیں

⊙ صاحب تفسیر روح المعانی جناب آلوسی کا آیت مودت کے بارے میں نظریہ اور اس پر تفسیر نمونہ کا تبصرہ

۱۔ تفسیر فخر رازی، جلد ۲۷، ص ۱۶۶۔

یہاں پر ایک سوال جو بہت سے لوگوں کے پیش نظر ہے اور مشہور مفسر آلوسی نے اسے شیعوں پر ایک اعتراض کی صورت میں اپنی تفسیر روح المعانی میں پیش کیا ہے، بیان کرکے اس کا تجزیہ و تحلیل کریں گے آلوسی کی گفتگو کاخلاصہ کچھ یوں ہے:

"بعض شیعوں نے اس آیت کو علی علیہ السلام کی امامت پر دلیل کے طور پر پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ علی علیہ السلام کی محبت واجب ہے اور جس کی محبت واجب ہوتی ہے اس کی اطاعت بھی واجب ہوتی ہے اور جس کی اطاعت واجب ہوتی ہے وہ امام ہوتا ہے۔ اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ علی ع مقام امامت کے مالک ہیں اور اسی آیت کو انہوں نے دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔

لیکن ان کی یہ باتیں کئی لحاظ سے قابل اعتراض ہیں پہلے تو یہ کہ اس آیت کو محبت کے وجوب پر دلیل ہم اس وقت مانیں گے جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ آیت پیغمبر خدا ص کے اقرباء کی محبت کے معنی میں ہے جب کہ بہت سے مفسرین نے اس معنی کو تسلیم نہیں کیا ان کی دلیل ہے کہ یہ بات مقام نبوت کے شایان شان نہیں ہے کیونکہ اس سے آپ کی ذات پر تہمت آتی ہے کہ آپ کا یہ مقام دنیا پرستوں کے کام جیسا ہوگا کہ پہلے تو وہ کسی کام کو شروع کردیتے ہیں پھر اس کے فوائد اور منافع کا اپنی اولاد اور رشتہ داروں کے لیے مطالبہ کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بات سورۂ یوسف کی آیت ۱۰۴ کے بھی منافی ہے جس میں ارشاد ہے" وَما تَسْئَلُهُم عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ "یعنی اے پیغمبر! تم ان لوگوں سے اپنی اجرت طلب نہیں کرتے۔

دوسرے یہ کہ: ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ محبت کا وجود اطاعت کی دلیل بن سکے کیونکہ ابن بابویہ اپنی کتاب "اعتقادات" میں کہتے ہیں کہ: امامیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ علویوں کی محبت لازم ہے جبکہ وہ ان سب کو واجب الاطاعت نہیں سمجھتے۔

تیسرے یہ کہ ہم یہ بات بھی نہیں مانتے جس شخص کی اطاعت واجب ہوتی ہے وہ امام یعنی زعامت کبری کا مالک بھی ہو وگرنہ پیغمبر اپنے زمانے میں امام ہوتا ہے، جب کہ ہم جناب طالوت کی داستان میں پڑھتے ہیں کہ وہ ایک گروہ کے امام ہوئے جبکہ اس زمانے میں ایک اور پیغمبر بھی موجود تھے۔

چوتھے یہ کہ آیت کا تقاضا ہے کہ تمام اہلبیت واجب الاطاعت ہوں، اور اسی بنا پر وہ سب امام ہوں جبکہ امامیہ کا ایسا عقیدہ نہیں ہے۔[۱]

آلوسی کے اعتراض پر ایک تحقیقی نظر

آیۂ مودت اور دوسری آیات میں بہت سے موجود قرائن میں غور کرنے سے ان میں سے کئی اعتراضات کا جواب واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے۔

کیونکہ ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ یہ محبت کوئی معمولی اور عام چیز نہیں ہے بلکہ یہ تو نبوت کی جزا اور رسالت کا اجر ہے اور فطرۃً اس محبت کو بھی نبوت و رسالت کے ہم پلّہ ہونا چاہیئے تاکہ اس کا اجر قرار پا سکے۔

پھر دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے اور قرآن مجید گواہی دیتا ہے کہ اس محبت کا فائدہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو خود آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پہنچے بلکہ اس کا سو فیصد فائدہ خود مومنین کو پہنچتا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ ایک ایسا معنوی امر ہے جو مسلمانوں کی ہدایت کے ارتقاء میں موثر ہے۔

اس طرح سے اگرچہ آیت کے ظاہر سے محبت کے وجوب کے علاوہ اور کوئی چیز معلوم نہیں ہوتی لیکن اس محبت کے وجوب کے لیے جو قرائن مذکور ہوئے ہیں وہ مسئلہ امامت کو واضح کرتے ہیں بلکہ جو مقام نبوت و رسالت کا مددگار اور پشت پناہ ہے۔

مندرجہ بالا مختصر سی وضاحت کے بعد ہم مذکورہ اعتراض کا جواب پیش کرتے ہیں۔

۱۔ تفسیر روح المعانی جلد ۲۵، ص ۲۷ (اسی آیت کے ذیل میں)

۵۹) /آیہ مودت تفسیر نمونہ اور تفسیر روح المعانی کی نگاہ میں

پہلے تو یہ کہ آلوسی کہتے ہیں کہ بعض مفسرین اس آیت سے مودّت اہلبیت مراد نہیں لیتے . یہ بات ماننی پڑے گی کہ پہلے سے کئے ہوئے فیصلے اور رسومات ایسا کرنے میں حائل ہوئی ہیں . مثال کے طور پر کچھ لوگ تو" قربیٰ " کا معنی " خدا کا تقرب کرتے ہیں جب کہ قرآن مجید کی تمام آیات میں جہاں جہاں بھی یہ کلمہ استعمال ہوا ہے وہاں پر" قریبی رشتہ داروں "کے معنی میں ہے۔

یا بعض لوگ اس کی پیغمبر اسلام ص کی عرب قبائل کے ساتھ رشتہ داری سے تفسیر کرتے ہیں جب کہ یہ تفسیر آیت کے نظام کو مکمل طور پر درہم برہم کر دیتی ہے . کیونکہ اس صورت میں اجر رسالت ان لوگوں سے طلب کیا جارہا ہے جنہوں نے رسالت کو قبول کر لیا ہے اور جو لوگ پیغمبر اکرم ص کی رسالت کو قبول کر چکے ہوں پھر کیا ضرورت ہے کہ ان سے یہ تقاضا کیا جائے کہ وہ پیغمبر اکرم ص کی رشتہ داری کا پاس کرتے ہوئے انہیں تکلیف دینے سے باز رہیں۔

پھر کیا وجہ ہے کہ جب بے انتہا روایات آیت کو اہلبیت علیہم السلام کی ولایت سے تفسیر کرتی ہیں انہیں چھوا تک نہ جائے ؟

اس لیے یہ بات قبول کرنا پڑے گی کہ مفسرین کے اس گروہ نے ہر گز خالی

الذہن ہو کر آیت کی تفسیر نہیں کی، ورنہ کوئی پیچیدہ بات آیت کے مطلب میں موجود نہیں ہے۔

اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ مودّت اہلبیت ع کا تقاضا نہ تو مقام نبوت کے منافی ہے اور نہ ہی اسے دنیا پرستوں کے طریقہ کار پر قیاس کیا جا سکتا ہے.

اور یہ معنی سورہٴ یوسف کی آیت ۱۰۴ سے بھی مکمل طور پر ہم آہنگ ہے جو ہر قسم کی اجرت کی نفی کر رہی ہے، کیونکہ اہلبیت ع کی مودت کا اجر حقیقت میں ایسا اجر نہیں ہے جس سے خود رسول اللہ ص کو کوئی فائدہ ہو، بلکہ اس میں خود مسلمانوں کا اپنا فائدہ ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ صحیح ہے کہ عام اور معمولی محبت اطاعت کے وجوب کی ہرگز دلیل نہیں بن سکتی لیکن جب ہم اس بات کو پیش نظر لاتے ہیں کہ یہ محبت کوئی عام محبت نہیں بلکہ نبوت و رسالت کے ہم پلہ ہے تو یقین ہو جاتا ہے کہ اطاعت کا وجوب بھی اسی میں پوشیدہ ہے اور یہیں پر یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ابن بابویہ (شیخ صدوق) کی گفتگو بھی اس امر کے منافی نہیں ہے۔

تیسرے یہ کہ یہ ٹھیک ہے کہ ہر اطاعت کا وجوب زعامت کبری اور امامت کی دلیل نہیں بن سکتی لیکن یہ بات بھی تومد نظر ہونی چاہیئے کہ جس اطاعت کا وجوب، رسالت کا اجر قرار پا رہا ہے وہ امام کے علاوہ کسی اور کے شایان شان نہیں ہو سکتی۔

چوتھے یہ کہ: امام بمعنی رہبر و پیشوا... ہر دور میں صرف ایک ہی شخصیت ہو سکتی ہے اور بس لہٰذا تمام اہلبیت کی امامت کا کوئی معنی نہیں ہے. اس کے علاوہ آیت کا معنی سمجھنے میں روایات کے تعلق کو بھی بہر صورت پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

پھر یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ آلوسی نے ذاتی طور پر مودت اہلبیت کو بہت بڑی اہمیت دی ہے اور مندرجہ بالا بحث سے چند سطور پہلے وہ لکھتے ہیں :

حق بات یہ ہے کہ پیغمبر اسلام ص کے اقرباء کی مودت بوجہ ان کے پیغمبر کا رشتہ دار ہونے کے واجب ہے اور قرابت جتنی زیادہ قوی ہوگی محبت کا وجوب اس قدر بیشتر ہوگا۔

آخر میں کہتے ہیں

اس مودت کے آثار پیغمبر اسلام ص کے اقرباء کی تعظیم، احترام اور ان کے حقوق کی ادائیگی سے ظاہر ہوتے ہیں. جبکہ بعض لوگ اس بارے میں سستی سے کام لیتے ہیں حتیٰ کہ اقرباء پیغمبر ص سے محبت کو ایک قسم کی رافضیت سمجھتے ہیں لیکن میں ایسا نہیں کہتا بلکہ وہی کہتا ہوں جو امام شافعی نے اپنے جاذب اور دل نشین اشعار میں کہا ہے۔

پھر وہ امام شافعی کے مذکورہ اشعار نقل کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

اس کے ساتھ میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ میں اہلسنت کے بزرگوں کے عقائد سے باہر نہیں ہوں جو وہ صحابہ کرام کے بارے میں رکھتے ہیں اور ان کی محبت کو بھی واجب سمجھتا ہوں۔[۱]

⊙ کشتی نجات

جناب فخر الدین رازی نے اسی بحث کے ذیل میں ایک نکتے کو بیان کیا ہے اور اسے اپنا پسندیدہ نکتہ قرار دیا ہے اور مفسر آلوسی نے بھی اسے "ایک لطیف نکتہ" کے عنوان سے اپنی تفسیر روح المعانی میں انہیں سے نقل کیا ہے یہ وہ نکتہ ہے جو ان کے خیال کے مطابق بہت سے تضادات کو برطرف کر رہا ہے

ایک طرف پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ارشاد فرماتے ہیں

"مثل اهل بيتي كمثل سفينة نوح من ركبها نجیٰ"

(میرے اہل بیت کشتی نوح کے مانند ہیں جو اس پر سوار ہوا وہ نجات پا گیا) اور دوسری طرف اشارہ فرماتے ہیں

"اصحابي كالنجوم بايهم اقتديتم اهتديتم"

(میرے اصحاب ستاروں کے مانند ہیں ان میں سے جس کی اقتداء کروگے ہدایت پا جاؤ گے)۔

اب ہم فرائض کی ادائیگی کے سمندر میں گرفتار ہیں، شکوک و شبہات اور خواہشات نفسانی کی موجیں ہمیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور جیسے سمندر کو عبور کرنا ہوتا ہے اسے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک کشتی جو ہر طرح کے عیب ونقص سے پاک ہو اور دوسرے چمکدار اور روشن ستارے جن کے ذریعے کشتی کی راہوں کو متعین کیا جاتا ہے، جب انسان کشتی پر سوار ہو جائے اور اپنی نگاہیں ستاروں پر لگائے رکھے تو نجات کی

۱۔ روح المعانی، جلد ۲۵، ص ۲۸۔

امید ہو سکتی ہے . اسی طرف اہل سنت میں جو شخص آل محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی محبت کی کشتی پر سوار ہو کر ستاروں جیسے اصحاب پر اپنی نگاہیں جمائے رکھے توامید ہے کہ خدا اسے دنیا وآخرت کی سلامتی اور سعادت سے بہرہ مند کر دے۔[1]

لیکن ہم کہتے ہیں کہ یہ شاعرانہ تشبیہ اگرچہ ظاہری طور پر دلکش اور جاذب نظر تو ہے لیکن صحیح معنوں میں درست نہیں ہے کیونکہ ایک تو کشتی نوح اس وقت نجات کا ذریعہ بنی جبکہ طوفان کے پانی نے ہر جگہ کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور وہ ہمیشہ چلتی رہی تھی ،دوسری عام کشتیوں کے مانند کسی ایک منزل مقصود کی طرف اس کی حرکت نہیں تھی کہ ستاروں کے ذریعے اس منزل کا تعین کیا جاتا. بلکہ منزل مقصود خود کشتی ہی تھی اور یہ اس وقت تک اپنے حال پر قائم رہی جب تک کہ طوفان کا پانی ختم نہیں ہو گیا اور کشتی کوہ جودی پر ٹھہر نہیں گئی اور کشتی کے سوا روں نے نجات نہیں پالی۔

دوسرے یہ کہ اہلسنت بھائیوں کی کتابوں میں درج ایک روایت میں جو کہ پیغمبر اسلام ص سے منقول ہے یوں آیا ہے:

النجوم امان الاهل الارض من الغرق واهل بیتی امان لامتی من الاختلاف فی الدین

ستارے اہل زمین کے لیے امان ہیں ان کی غرق ہونے سے اور میرے اہل بیت میری امت کے لیے دین میں اختلاف سے امان ہیں۔[2]

" ⊙ ومن یقترف حسنة نزد له فیها حسناً "

۱۔ تفسیر فخر الدین رازی جلد ۲۷، ص ۱۶۷۔

۲۔ مستدرک حاکم جلد ۳، ص ۱۴۹ منقول از عباس، حاکم پھر کہتے ہیں " هذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاه) " یہ حدیث معتبر ہے لیکن بخاری اور مسلم نے اسے نقل نہیں کیا ہے

(جو شخص کوئی نیکی کمائے گا ہم اس کی اچھائی میں اضافہ کر دیں گے) اس جملے میں لفظ "اقتراف" اصل میں " قرف" (بروزن "حرف") کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے درخت کی اضافی چھال کا اتار لینا یا زخم کی اضافی کھال کا اتار لینا کہ بعض اوقات جس سے صحت وتندرستی حاصل ہو جاتی ہے . بعد میں یہ کلمہ اکتساب (کمانے اور حاصل کرنے)کے معنی میں استعمال ہونے لگا خواہ یہ اکتساب اچھا ہو یا برا لیکن راغب کہتے ہیں کہ یہ کلمہ خوبی کی نسبت برائی کے لیے زیادہ استعمال ہوتا ہے (اگر چہ اس آیت میں خوبی کے لیے استعمال ہوا ہے)

یہی وجہ ہے کہ عربوں میں ایک ضرب المثل مشہور ہے:

الاعتراف یزیل الاقتراف

گناہ کا اعتراف گناہ کو مٹا دیتا ہے۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ ابن عباس اور ایک اور متقدم مفسر "سدّی" سے منقول ہے کہ آیت میں "اقتراف حسنة " سے مراد، آل محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مودت ہے۔[1]

ایک اور حدیث جو کہ ہم امام حسن علیہ السلام کے حوالے سے بیان کر آئے ہیں میں آیا ہے:

اقتراف الحسنة مودتنا اهل البيت

نیکی کمانے سے مراد ہم اہلبیت کی مودت ہے۔

١۔ مستدرک حاکم جلد ٣، ص ١٤٩ منقول از عباس، حاکم پھر کہتے ہیں " ھٰذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاه) " یہ حدیث معتبر ہے لیکن بخاری اور مسلم نے اسے نقل نہیں کیا ہے

ظاہر ہے کہ اس طرح کی تفسیروں کی مراد اکتساب حسنہ کے معنی کو اہلبیت علیہم السلام کی مودت میں محدود کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا نہایت وسیع اور عمومی معنی ہے لیکن چونکہ یہاں پر ذوی القربیٰ کی مودت کے بعد آیا ہے لہٰذا اس کا واضح ترین مصداق یہی مودّت ہے۔

⊙ سورہ شوریٰ کی یہ چند آیات مدنی ہیں

جیساکہ سورہ شوریٰ مکی سورتوں میں سے ہے. لیکن بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ چار آیات (آیت ۲۳ تا ۲٦) مدینہ میں نازل ہوئی ہیں لیکن جیسا کہ ہم آغاز میں بتا چکے ہیں کہ ان آیات کی شان نزول ہمارے اس مدعا کی دلیل ہے اور وہ روایات بھی اسی بات کے لیے اچھی دلیل ہیں جن کے مطابق اہل بیت سے علی علیہ السلام، فاطمہ سلام اللہ علیہا، حسن علیہ السلام، حسین علیہ السلام، مراد ہیں. کیونکہ معلوم ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کا سیدہ طاہرہ علیہم السلام سے عقد مدینہ منورہ میں انجام پایا اور مشہور روایات کی بناپر جناب حسن علیہ السلام اور جناب حسین علیہ السلام کی ولادت تیسری اور چوتھی ہجری میں ہوئی۔

مصادر

۱۔۱۔ مجمع البیان جلد ۹، ص ۲۹

۲۔ "احقاق الحق" جلد ۳، ص د ۲، ص نیز قرطبیؒ نے بھی اسی روایت کو اسی آیت کے ذیل میں درج کیا ہے.
ملاحظہ ہو تفسیر قرطبیؒ جلد ۸، ص ۵۸۴۳۔

۳۔ "متدرک الصحیحین" جلد ۳، ص ۱۷۳ محب الدین طبرسی نے بھی اسی حدیث کو اپنی کتاب "ذخائر العقبیٰ"
کے ص ۱۳۷ میں اور ابن حجر نے اپنی کتاب "صواعق محرقہ "میں نقل کیا ہے ملاحظ ہو ص ۱۰۱۔

۴۔ تفسیر در منثور جلد ۶ صفحہ ۷ اسی آیت کے ذیل میں

۵۔ تفسیر طبری جلد ۲۵، ص ۱۶، ۱۷

۶۔ تفسیر مجمع الیبیان، جلد ۹، ص ۲۹۔

۷۔ تفسیر فخر رازی، جلد ۲۷، ص ۱۶۶۔

۸۔ تفسیر روح المعانی جلد ۲۵، ص ۲۷ (اسی آیت کے ذیل میں)

۹۔ روح المعانی، جلد ۲۵، ص ۲۸۔

۱۰۔ تفسیر فخر الدین رازی جلد ۲۷، ص ۱۶۷۔

۱۱۔ متدرک حاکم جلد ۳، ص ۱۴۹ منقول از عباس، حاکم پھر کہتے ہیں " ھٰذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاہ) " یہ
حدیث معتبر ہے لیکن بخاری اور مسلم نے اسے نقل نہیں کیا ہے(

۱۲۔ تفسیر "مجمع البیان "اسی آیت کے ذیل میں، تفسیر صافی اور تفسیر قرطبیؒ

قرآن وحدیث کی روشنی میں انتظار امام زمانہ کے مختلف پہلوؤں پر اجمالی نگاہ

ڈاکٹر جابر محمدی[1]

خلاصہ

حضرت امام مہدی عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف کا انتظار ایک ایسی حقیقت ہے جس کے بارے میں اہلسنت و شیعہ مصادر میں اس قدر روایات موجود ہیں کہ کئی علماء نے ان کے تواتر کا دعوی کیا ہے۔اب یہ انتظار کیا ہے اور اس انتظار کے دوران کیا کچھ کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے کون سے پہلو آیات و روایات کی روشنی میں بیان کیے جاسکتے ہیں اس بارے میں اس مختصر تحریر میں ترجمہ و تحقیق پیش کی گئی ہے۔انتظار کے اہم پہلوؤں میں سے فکری اور روحانی صلاحیتوں کو نکھارنا اور امور میں نظم جیسی اہم مباحث کو قرآنی آیات اور احادیث معتبرہ کی روشنی میں بیان کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے حقیقی انتظار کے لیے صرف ظاہری اعمال و کردار کا درست ہونا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے فکری اور باطنی درستگی بھی بہت ضروری ہے۔

بنیادی کلمات: انتظار، قرآن، آیات، روایات، پہلو، مصادر

۱۔ فیکلٹی ممبر شعبہ قرآنیات، المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی قم

تمہید

انتظار کیا ہے؟اس کے بارے میں اتنی تاکید اور گفتگو کیوں کی گئ ہے؟انتظار کے پیغام کو نہ صرف رسول خدا (ص) کے عظیم کلام کے ذیل اور علی ابن ابی طالب (ع) کے لاثانی اور لاجواب فرمائشات میں دیکھا جاسکتا ہے کہ جن دونوں نے اس امت کے باپ کا لقب پایا:

قال رسول الله (ص))"انا و علی ابوا هذا الامة"[1]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں اور علی اس امت کے باپ ہیں۔

بلکہ تمام معصومین علیہم السلام نے اس کی ضرورت اور اہمیت سے انسان کو آگاہ کیا ہے۔

انتظار کا معنی اور اس کی حقیقت کو ہم اس وقت درک کر سکتے ہیں جب ہمیں یہ معلوم ہو کہ امام زمانہ عج کو کس لئے چاہتے ہیں یعنی مہدی موعود (عج) کی معرفت حاصل کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اسے کس لئے چاہتے ہیں اور اس کے وجود کی کیا ضرورت ہے؟ جب تک اس سوال کی تشنگی کا احساس نہیں کریں گے اس وقت تک اس کی حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے جس وقت تک انتظار اور اس کی ضرورت کا احساس اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی خوبصورت الفاظ میں حجت اور امام عصر کی ضرورت کی طرف مضطرب ہونا نہ پایا جائے گا اس وقت تک ہم ان کی تلاش میں نہیں نکلیں گے اور ان کے ظہور کے انتظار کے لئے کوئی اقدام نہیں کریں گے۔

امامت کی ضرورت کا احساس ابتداء ہی سے ہونا چاہئے وہی ضرورت جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود کی تھی بالکل وہی ان کے ولی کے وجود کی ضرورت بھی ہے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں لوگوں کو دو چیزیں گمراہی سے بچاتی تھیں ایک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود مبارک اور دوسرا قرآن مجید کی آیات کی تلاوت۔

---

[1] ۔ عیون اخبار الرضا ج ۱ ص ۸۵، تفسیر برہان ج ۱ ص ۳۶۹

وَ كَيْفَ تَكْفُرُونَ وَ أَنْتُمْ تُتْلَى عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللهِ وَ فِيكُمْ رَسُولُهُ۔[۱]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد بھی ایک ایسے خلیفہ کی ضرورت ہے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصیات یعنی علم، آزادی اور عصمت رکھتا ہو اور احکام کے علاوہ موضوعات کو بھی جانتا ہو امام علیہ السلام سورہ قدر کی تفسیر میں فرماتے ہیں تم اس سورت کے ذریعے امامت کے مخالفین سے بحث کرو[۲] وہ عمل جو ملائکہ اور روح نازل کرتے ہیں اور وہ رابطہ جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آسمان اور زمین کے درمیان موجود ہے یہ کس کے لئے ہے؟ ولی امر وہ ہے جس پر شب قدر کو "امر" بھیجا جاتا ہے پس وہ حکم اور موضوع دونوں میں غلطی اور اشتباہ کا شکار نہیں ہوتا، ہمارے اعمال اس کی بارگاہ میں پیش کئے جاتے ہیں وہ ہماری صورتحال سے باخبر ہیں حتی کہ ان کو دیکھتے ہیں:

قُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُولُهُ وَ الْمُؤْمِنُونَ۔[۳]

اس کے علاوہ دوسری بات جو ہمیں انتظار کے مفہوم کو درک کرنے میں مدد دے سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنے نفس کی طرف رجوع کریں:

لَنْ يَلِجَ مَلَكُوتَ السَّمَاءِ مَنْ لَمْ يُولَدْ مَرَّتَيْنِ۔[4]

امام صادق علیہ السلام نے حضرت عیسی کے حکمت آمیز کلمات کو نقل کرتے ہوئے فرمایا: ملکوت تک وہی شخص جا سکتا ہے جو دوبارہ متولد ہو (پہلی ولادت ملک اور رحم مادر سے ہے اور دوسری ولادت ہمیں ملکوت تک پہنچاتی ہے) کیونکہ انسان ہر چیز سے زیادہ اپنے آپ سے آشنا ہے اگر ابوذر جیسی شخصیات ایک توجہ کے ساتھ بدل جاتی ہیں اور اپنی راہ زندگی متعین کر لیتی ہیں تو وہ اسی وجہ سے ہے کہ انہوں نے اپنے نفس کو اس طرف مائل کیا ہے، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ہم انتظار کے مفہوم پر دوبارہ گہری توجہ کریں اس مختصر تحریر میں ہم صرف انتظار کے

۱۔ آل عمران ۱۰۱

۲۔ بحار جلد ۲۵ ص ۷۱، ح ۶۲

۳۔ توبہ ۱۰۵

۴۔ شرح اصول کافی ملاصدرا، ج ۱، ص ۱۶۳ و ص ۴۱۷

مختلف پہلوؤں کو بیان کرنے کی کوشش کریں گے اور بقیہ موضوعات انشاء اللہ اگلی تحریروں میں زیر بحث آئیں گے۔

انتظار کے مختلف پہلو

وہ شخص جو انتظار میں ہے وہ تیاری کرتا ہے تاکہ اپنی کمزوریوں کو دور کرکے موانع کو پہچانے اور دشمن کی کمزوریوں سے استفادہ کرتے ہوئے اس کو شکست دے اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تیاری کس مقام پر ہو اور کس صورت میں ہو؟

اس بات کی وضاحت کے لئے یہ کہنا ضروری ہے کہ انتظار کرنے والے انسان کو ہر لحاظ سے تیار رہنا چاہئے فکری اور روحی تیاری ہو انتظام و اہتمام کا مسئلہ ہو یا عملی اقدامات ہوں۔

(الف) فکری صلاحیتیں

مضبوط عمارتوں اور عظیم ذمہ داریوں کے لئے مضبوط بنیادوں کی ضرورت ہوتی ہے جو احساس اور شعور میں گھر کر چکی ہوں اس لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لكل شی دعامة و دعامة هذا الدين الفقه والفقيه الواحد اشد على الشيطان من الف عابد[1]

ترجمہ: ہر چیز کے لئے کوئی نہ کوئی بنیاد ہوتی ہے اور دین اسلام کی اساس گہرا فہم و ادراک ہے شیطان کے مقابلے میں ایک فقیہ کی حیثیت ہزار عبادت گزاروں سے (جو بغیر معرفت کے عبادت کرتے ہیں) کہیں زیادہ اور موثر ہے۔

لہٰذا زمانہ انتظار میں ہمیں اپنی فکری بنیادیں مضبوط کرنا ہوں گی تاکہ مختلف افکار و نظریات کے سامنے سر تسلیم خم نہ ہوں لیکن اسے کیسے عملی جامہ پہنایا جائے؟ بعض کا خیال ہے کہ صحیح نظریہ اپنانے کے لئے تمام نظریات کی شناخت ضروری ہے لیکن یہ تجزیہ و تحلیل صحیح نظریہ کے انتخاب میں کافی نہیں ہے کیونکہ بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ تمام اچھی باتوں کو سنو اور پھر ان میں سے بہترین کا انتخاب کرلو:

۱۔ نہج الفصاحۃ ج ۹۰

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ۔[۱]

پس آپ میرے ان بندوں کو بشارت دے دیجیے جو بات کو سنا کرتے ہیں اور اس میں سے بہتر کی پیروی کرتے ہیں۔

لیکن بہترین کو کس اصول پر پرکھنا ضروری ہے یہ اصول کیا ہیں؟

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

کفی بالمرء جھلا ان لا یعرف قدرہ[۲]

انسان کی نادانی کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ اپنی معلومات کے لئے کوئی اصول اور ضابطہ نہ رکھتا ہو اور اپنی اہمیت کو نہ پہچانتا ہو۔

فکری اعتبار سے ایک منتظر شخص کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ معرفت، ادراک اور اپنی قدر و منزلت کی پہچان ہے اور یہی مختلف مذاہب کے انتخاب کا معیار بھی ہے جو انسان کو مختلف نظریات کے مقابلے میں صحیح راہنمائی کرکے اچھے نظریہ کو انتخاب کرنے کی صلاحیت دیتا ہے کیونکہ بہترین نظریہ کو جن نعروں کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے جب اس نعرے اور اپنے وجود کے درمیان تقابل کیا جائے تو اس وقت انتخاب کا مرحلہ سامنے آتا ہے اسی معیار کی بنا پر آپ مختلف گروہوں اور مذاہب کے نظریات پر بھی تبصرہ کرسکتے ہیں ضروری نہیں کہ ان تمام مذاہب کا مطالعہ کیا جائے بلکہ اتنا ہی کافی ہے کہ ان مذاہب کے بارے میں یہ جان لیا جائے کہ انہوں نے انسان کی آخرت اور سرانجام کے لئے کیا نظریہ پیش کیا ہے مثلا جب آپ اپنے لئے جوتا خریدنا چاہتے ہیں تو کسی بھی جوتوں کی دکان میں موجود تمام جوتوں کو پہن کر نہیں دیکھتے بلکہ آپ کے پاؤں کا سائز اور نمبر آپ کو بہترین جوتے کے انتخاب میں مدد کرتے ہیں۔

۱۔ زمر ۱۸

۲۔ نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۶

مذاہب کے بارے میں بھی یہی طریقہ کار رائج ہے جب میں اپنی انسانی حقیقت کو سمجھ لیتا ہوں اور اس کو پہچانتا ہوں تو پھر اس چیز کے درپے ہو جاتا ہوں کہ مختلف مذاہب ایسے انسان کے لئے کس طرح کا لباس بناتے ہیں تو اس سے میں سمجھ جاتا ہوں کہ وہ مختلف لباس جو انہوں نے میرے لئے بنائے ہیں وہ میرے پاؤں کی ایک انگلی تک کو نہیں ڈھانپ سکتے صرف ایک مذہب ایسا ہے جسے مذہب شیعہ کہتے ہیں جس کے اہداف اور مقاصد انسان کی حقیقی اہمیت اور اس کے وجودی تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔

یہ راستہ ہمارے لئے بہت ساری مشکلات کو حل کر دیتا ہے اور اس آغاز سے ہم ان واقعات کو ایجاد کر سکتے ہیں جن کے ذریعہ دوسروں کے افکار اور نظریات سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے اور یہ وہ حقیقت اور ایسا فکری رجحان ہے جو مختلف افکار کے سامنے استقامت کر سکتا ہے انسان لامتناہی استعداد کا حامل ہے:

أتزعم انک جرم صغیر وفیک انطوی العالم الاکبر[1]

اگر ہم اس پر یقین کر لیں تو پھر ہم ایک ایسے مقام پر ہیں کہ جس کا آخر معلوم نہیں اور ہم مجبور ہیں کہ ہمیشہ متحرک رہیں۔

(ب) روحانی صلاحیتیں

ایک منتظر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اعلی درجے کی روحانی صلاحیت کا مالک ہو تاکہ حادثات اور مصیبتوں کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح استوار رہے اور اپنی ذمہ داریوں کو روشن بینی کے ساتھ سنبھال سکے حقیقت میں میرے وجود کی وسعت ہی مجھے حوادث زمانہ کے سامنے مضبوط بنا سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب ایک منتظر دعا کرتا ہے تو وہ خدا سے معرفت کو طلب کرتا ہے (**اللھم عرفنی نفسک** اے خدا مجھے اپنی معرفت عطا کر دے)

۱۔ ریاض السالکین ج ۷ ص ۲۱۹ تفسیر صافی ج ۱ ص ۶۷

اسی طرح پائے ثبات کا طلبگار ہوتا ہے ''ثبتنی علی دینک" اور وہ صبر و شکیبائی کا متمنی رہتا ہے (صبرنی علی ذلک)[۱]

ایک منتظر کو چاہیئے کہ وہ اس قدر مضبوط ارادے کا حامل ہو کہ دنیاوی رنج والم کے سامنے آسائش وآرام کا احساس کرسکے کیونکہ زمانہ غیبت میں لوگوں کو سخت امتحانات میں ڈالا جائے گا جس سے ان کے پائے ثبات میں لغزش آسکتی ہے جیسا کہ امام باقر علیہ السلام نے اپنے ایک صحابی کے جواب میں فرمایا جس نے پوچھا تھا کہ آپ کے فرج کا کونسا وقت ہے؟

آپ نے فرمایا:

هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لاَ يَكُونُ فَرَجُنَا حَتَّى تُغَرْبَلُوا ثُمَّ تُغَرْبَلُوا ثُمَّ تُغَرْبَلُوا يَقُولُهَا ثَلاَثاً حَتَّى يُذْهِبَ [اللَّهُ تَعَالَى] الْكَدِرَ وَيُبْقِيَ الصَّفْوَ.[۲]

ترجمہ: ہر گز نہیں ہر گز نہیں ہمارا فرج اتنا جلدی نہیں ہوگا حتی کہ تمہیں پاکیزہ کیا جائے امام نے تین مرتبہ یہ جملہ فرمایا حتی کہ کدورتیں چھٹ جائیں اور صدق و صفا باقی رہ جائے۔

روحانی صلاحیت کا ہونا بہت ہی اہم ہے جو زمانہ انتظار میں حاصل ہونی چاہئے لیکن جو چیز اس سے بھی اہم ہے وہ روحانی صلاحیت کو ایجاد کرنے کے راستے ہیں کہ کس طرح ایک منتظر شخص کے اندر کس راہ وروش کے ساتھ اس روحانی صلاحیت کو ایجاد کیا جائے اس کے لئے کچھ نکات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ خوداعتمادی

۱۔ مفاتیح الجنان دعائے غیبت امام زمانہ ع

۲۔ الغیبۃ (للطوسی)، جلد ۱، صفحہ ۳۳۹

وہ شخص جو اپنی اہمیت کو پہچان لیتا ہے وہ اپنے سے نادان افراد کے ذریعہ منحرف نہیں ہو سکتا ہماری روحانی وسعت اور ظرفیت کہ جس سے ہم بہت متاثر ہوتے ہیں اور اس کی اہمیت کے قائل ہیں وہ اسی چیز سے متعین ہوتی ہے کیونکہ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں "**قیمة کل امرءٍ ما یحسنه**"[۱]

قدر ا رجل علی قدر همته[۲]

ترجمہ: انسان کی اہمیت اسی چیز کے برابر ہے جو اس پر موثر واقع ہوتی ہے اور اس کے لئے قابل اہمیت ہے پس ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے وجود کی اہمیت کو اس حد تک پہچان سکیں کہ وہ چیزیں جو ہمارے لئے اہمیت رکھتی ہیں اور ہم پر موثر واقع ہوتی ہیں ہمارا وجود ان سے اعلی وارفع ہے ان سے ہمارے ارادے مضبوط ہوں گے جن کے باعث ہم متحرک اور فعال ہوں گے اور اس حرکت کے دوران جن مسائل سے ہمارا سامنا ہوگا ہم وقت سے پہلے ان کے لئے آمادہ و تیار ہوں گے۔

(۲) ذکر کی عظمت

ذکر کی عظمت سے انسان کے اندر شرح صدر پیدا ہوتا ہے اور قرآن نے اس بارے میں کیا ہی خوب فرمایا:

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ و وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِي أَنْقَضَ ظَهْرَكَ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔[۳]

وہ مقام کہ جہاں ذکر اور تمہاری یاد کو عظمت دی گئی ہے نہ تمہارے نام کو اسی لئے نہیں فرمایا: **ورفعنا لک اسمک** تمہارے اندر وسعت کو ایجاد کیا اور تمہارے سنگین اور کمر شکن وزن کو تم سے لے لیا یہاں تک کہ تم نے ہر رنج کے ساتھ دو قسم کی آسائشیں دیکھیں:

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔[۴]

۱۔ نہج البلاغہ قصار الحکم ۱۸

۲۔ نہج البلاغہ کلمات قصار ۴۷

۳۔ سورہ الشرح آیت ۱

۴۔ الشرح آیت ۵۔۶

یسر کے لفظ کو الف لام کے بغیر لا کر اور اس کا نکرہ کی صورت میں تکرار کر کے یہ بتایا گیا کہ ہر رنج و غم کے بدلے دو قسم کے آرام و سکون ہیں ایک تو تمہیں مستحکم ارادہ اور دوسرا رفعت ذکر عطا کیا گیا جس کے ذریعہ تم شرح صدر تک رسائی حاصل کر پائے۔

(۳) راستے کی کامل شناخت:۔

جو تمام راستے کو دیکھ لیتا ہے وہ موانع کو بھی پہچان لیتا ہے یہ منتظر شخص با معرفت وجود ہی ہے جو حوادث زمانہ اور مصائب کے سامنے سر تسلیم خم نہیں ہوتا کیونکہ وہ پہلے سے تیار اور منتظر ہوتا ہے لیکن وہ لوگ جو خیالات کی دنیا اور بے جا توقعات کے ساتھ راستے کا انتخاب کرتے ہیں اور ان کے گمان میں وہ جوں ہی راستے پر چلیں گے سارے کے سارے دشمن تسخیر ہو جائیں یہ وہی افراد ہیں جن کے قدموں میں لغزش آ جاتی ہے لیکن وہ لوگ جنہوں نے موانع کو دیکھا اور ان کا مقابلہ کیا اور روحانی کمال تک رسائی حاصل کی وہ صبر و استقامت کے ساتھ اپنے راستے پر گامزن رہتے ہیں۔

(۴) تقویٰ اور اطاعت

جو بھی اپنی حدود کو پہچانتا ہے اور اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتا ہے اور پھر ان ذمہ داریوں پر عمل کرنا چاہتا ہے تو ایسے شخص کے لئے کسی قسم کا دباؤ نہیں بلکہ وہ وادی امن میں براجمان ہے:

"ان المتقین فی مقام امین"[۱]

ایسا شخص جو اپنی ذمہ داری کو پہچانے وہ وحی کو بھی سمجھتا ہے اور آئندہ سے بھی اسے کوئی خوف نہیں اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس سے بھی لاتعلق ہے رسول اکرم نے فرمایا:

"ماکنت بدعا من الرسل"

رسولوں میں سے میں کوئی بدعت اور نئی چیز نہیں لے کر آیا

"ومآادری مایفعل بی ولابکم"

۱۔ دخان ۵۵

میں بھی نہیں جانتا کہ میرے اور تمہارے لئے کیا پیش آنے والا ہے

"ان اتبع الا ما یوحی الیہ"[1]

میں صرف وحی کے مطابق حرکت کرتا ہوں کیونکہ یہی اطاعت، تقوی اور ذمہ داریوں پر عمل پیرا ہونا ہی امن لاتا ہے اور انسان کو حیرت سے خارج کرتا ہے، و من یتق اللہ یجعل لہ مخرجاً[2]

(۵) خدا سے گہرا تعلق

انسان کا رزق صرف کتاب کی تلاوت میں ہی مضمر نہیں بلکہ آفاق اور انفس میں بھی اس کی آیات اور نشانیوں کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے جس سے انسان کی فکری اور روحانی بنیادیں مستحکم ہوتی ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ لوگ جو دن کو مخلوق خدا کے ساتھ گذارتے ہیں اور رات کو یاد خدا میں رہتے ہیں اور اسی کے قرب سے رزق حاصل کرتے ہیں تاکہ روزمرہ زندگی کی مصروفیات اور لین دین کے ذریعہ اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طریقے سے نبھا سکیں اسی بنا پر رسول خدا کے لئے بھی ضروری تھا کہ وہ دن کی عبادت سے بڑھ کر رات کو بھی اٹھ کر عبادت کریں اور قرآن کی ٹھہر ٹھہر کر تلاوت کریں کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ قول ثقیل اور رسالت کی عظیم ذمہ داری کو اپنے کندھوں پہ لیں:

يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا۔[3]

یہ رات کا قیام، دعا، قرأت۔ یہ سب منتظر مومن کے لئے روزانہ کا رزق فراہم کرتے ہیں جو اس کی روزمرہ مشکلات کے لئے ایندھن کا کام دیتا ہے۔

(۶) مشق اور تمرین

۱۔ احقاف ۹۔۱۰

۲۔ سورہ طلاق آیت ۲۔

۳۔ مزمل ۱۔۵

اگر انسان اس معرفت کے ذریعہ جو وہ حاصل کر چکا ہے زندگی گزارے یعنی جو کچھ اس نے سمجھا اسی کے مطابق حرکت کرے اور اسی پر مشق کرے تو پھر بڑی بڑی ذمہ داریوں کو نبھا سکتا ہے اور یہ وہی لوگ ہیں جو ثابت قدمی تک رسائی حاصل کرتے ہیں (مثل کلمتہ طیبہ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء)[1]

پاکیزہ انسان کی مثال پاکیزہ درخت جیسی ہے جس کی جڑیں گہری اور جس کے شاخ و برگ وسیع ہیں

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ۔[2]

وہ لوگ جو ایمان لائے وہ اپنی ثابت اور مضبوط باتوں سے مستحکم ہیں انسان کے وہ کمالات کہ جن سے اس کی شخصیت تشکیل پائی اور وہ اس راہ میں رچ بس گئے ہیں انہی کے ساتھ وہ ثابت قدمی تک پہنچتا ہے اور توانائی حاصل کرتا ہے۔

ج: امور میں نظم

ایک منتظر کو چاہئے کہ وہ ایک منصوبے کے تحت حرکت کرے اور ایک بہترین نقشہ کے ذریعہ مصالح اور بھلائی کے درپے رہے جس کی پہلے سے اس نے پروگرامنگ کر رکھی تھی اس حوالے سے جن نکات کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ نصب العین

یہ منصوبہ کسی ھدف اور مقصد پر استوار ہو اور وہ مقصد اپنی اہمیت اور حیثیت کو پہچانتا ہو مقصد کو سامنے رکھ کر ہی اس منصوبے کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

۲۔ نصب العین کی اہمیت

وہ انسان جو اپنے آپ کو کائنات کا محصول سمجھتا ہے اور جس میں عظیم ہمت اور توانائی پائی جاتی ہے اور وہ بڑی بڑی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھا سکتا ہے وہ فقر، جہالت فسق، شرک اور کفر کو تحمل نہیں کر سکتا وہ اپنے اور سماج کے

۱۔ابراھیم ۲۴

۲۔ابراھیم ۲۷

اندر اس چیز کے درپے رہتا ہے کہ ان عظیم اقدار کو پروان چڑھائے اور ان مقدس اقدار کے لئے منصوبہ بندی کرے۔

۳۔ نصب العین کا تجزیہ

مقصد تک رسائی کے حصول کا بہترین ذریعہ موانع ختم کرنا اور انہیں منقسم کرنا ہے یعنی ضروری ہے کہ مسائل، ضروریات، مراحل اور موانع کی صحیح شناخت حاصل کی جائے اور اسی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فرد ارہنے کی بجائے حرکت کرے تاکہ مقصد تک رسائی حاصل کرنے کی راہ میں جتنے بھی مراحل ہیں ان تک پہنچ کر موانع کو ہٹانے کا سامان کیا جاسکے جب بھی عظیم مقاصد کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو وہ سہل اور آسان ہو جاتے ہیں اور چھوٹے اھداف جب تک مزید چھوٹے نہ کئے جائیں ناممکن اور محال نظر آتے ہیں۔

۴۔ آگاہی پر بھروسہ کرنا

اب یہ منصوبہ اور تقدیر منتظر انسان کو تکرار اور غلط کاری سے بچالیتا ہے کیونکہ پراکندہ افعال کو ایک منصوبے کی تسبیح میں پرو دیا گیا ہے اور انہیں مقصد کی راہ پر گامزن کر دیا گیا ہے اب آگاہی پر بھروسہ کرتے ہوئے اس میں مزید برکت آسکتی ہے۔ قرآن مجید نے کچھ عوامل کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جنہیں اپنا کر منتظر انسان دشمن کے مقابلے میں نہ صرف مستحکم ہو جاتا ہے بلکہ فتح بھی اسی کا مقدر بن جاتی ہے اگرچہ یہ دشمن دس برابر ہی کیوں نہ ہو قرآن نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ کچھ عناصر کی بدولت دشمن پر غلبہ پایا جاسکتا ہے اور پھر اس کی دلیل بیان کرتے ہوئے فرمایا:

بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ۔[1]

کیونکہ ان کے پاس آگاہی اور سمجھ بوجھ نہیں ہے پس آشنائی کا عنصر اتحاد اور ایمان کے ہمراہ منتظر مومن کو دس برابر دشمنوں کے مقابلے میں قدرت مند کر دیتا ہے۔

۷۔ عمل کی صلاحیت

۱۔ انفال ۶۵

عملی میدان میں دو عوامل کی ضرورت ہے جن کا ذکر انبیاء کے اسلوب تربیت میں بھی آیا ہے:

" لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ "[۱]

تمام انبیاء کو بینات (روشن نشانیاں) کے علاوہ کتاب اور میزان بھی دیا گیا دینی نظریات میں افراد صرف عمل کے ذریعہ نہیں بلکہ عمل کس نظریے کے ساتھ انجام دیا جارہا ہے اس سے ان کی اہمیت پتہ چلتی ہے اسلامی نظریہ میں سب کے سب جواب دہ ہیں (مسئول ہیں):

((کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته))

اس اہم کام کو انجام دینے کے لئے دو اور عوامل کی ضرورت ہے اور وہ کتاب اور میزان ہیں کتاب کے ذریعہ آئین اور دستور کی پہچان کی جاتی ہے اور جب دو حکم آپس میں ٹکرا رہے ہوں تو میزان اور معیار کے ذریعہ اس کا راہ حل نکالا جاسکتا ہے۔

ا: کتاب

کتاب سے مراد قرآن، توریت اور انجیل نہیں ہیں اور یہ بات واضح ہے کہ تمام انبیاء توریت انجیل، زبور اور قرآن جیسی کتابیں نہیں رکھتے تھے لہذا اس کتاب سے مراد وہی قوانین اور مکتوب ضوابط ہیں:

"کتب علیکم الصیام"[۲]

"کتب علیکم القتال"[۳]

ایک منتظر مومن شخص جو اپنے آپ کو روابط اور تعلقات کی دنیا میں گم دیکھتا ہے اور اس نظام کو اسباب و مسببات پر مشتمل اور علمی سمجھتا ہے وہ یونہی اقدام نہیں کرسکتا بلکہ اس کے ہر رابطہ اور تعلق کے لئے ایک ضابطہ اور قانون

۱۔ حدید ۲۵

۲۔ بقرہ ۱۸۲

۳۔ نساء ۷۷

کی ضرورت ہے کیونکہ انسان سے صرف ''عباد اللہ اور بلاد اللہ بلکہ بیابانوں اور چارپایوں سے بھی بازپرس ہوگی ،امیر المومنین علیہ السلام نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں :

''اتقوا اللہ فی عبادہ و بلادہ فانکم مسئولون حتی عن البقاع والبھائم [1]

عباد اللہ اور بلاد اللہ کی بابت اللہ سے ڈرو چونکہ بیابانوں اور چارپایوں سے بھی بازپرس ہوگی۔

۲۔ معیار

تمام موجودات کی بابت ذمہ داری اور حکم موجود ہے ان ذمہ داریوں کا آپس میں کوئی تضاد نہیں لیکن جہاں پر چند ذمہ داریاں ایک ہی وقت میں تمہارے اوپر عائد ہو جائیں تو وہاں مشکل پیش آسکتی ہے اگر ایک محدود وقت میں ان تمام قوانین کا سامنا کرنا پڑ جائے تو تم کیا کروگے کیا ایک کو انجام دے کر باقی کو چھوڑ دوگے یا باقی کی نسبت پریشانی کو گلے لگاؤگے یا تضاد اور ٹکراؤ کی صورت میں کسی معیار اور میزان کی تلاش میں نکلوگے یہ معیار مندرجہ ذیل ہیں :

الف : سبب، اور عمل کی تاثیر پر توجہ کرنا

حکم اور اس کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے سابقہ بیان کیے گئے امور کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے لہٰذا ایک منتظر مومن جب کسی حکم کا سامنا کرتا ہے یا کسی عمل کو انجام دینا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس معیار کی طرف توجہ کرے کہ کونسا عامل ہے جو اسے مجبور کر رہا ہے کہ وہ اس عمل کو انجام دے اور کیا اس کا یہ کام انجام دینا بہتر ہے یا کوئی دوسرا کام۔

(ب) : اہمیت، مشکل اور ہوا و ہوس کی مخالفت

جب بھی تمہارے سامنے دو کام اور فعل آتے ہیں تو دیکھو کہ ان میں سے خدا کسے زیادہ پسند کرتا ہے اور کس کی اہمیت دوسرے سے زیادہ ہے اگر خدا کی نگاہ میں دونوں برابر ہیں تو پھر دیکھو کونسا تمہارے لئے مشکل ہے جو مشکل ہوگا وہی تمہارے لئے بہتر ہے :

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۶۷

افضل الاعمال احمزھا[۱]

جہاں پر دونوں افعال مشکل ہونے کے لحاظ سے برابر ہوں وہاں معیار ہوا و ہوس کی مخالفت ہوگا امام علی علیہ السلام اپنے بھائی کی خصوصیات کو گنتے ہوئے فرماتے ہیں :

وکان اذا بدھه امران ینظر ایھما اقرب الی الھوی فیخالفه[۲]

وہ جہاں بھی اچانک دو کاموں کا سامنا کرتا تھا اسے اس بات پر عبور حاصل تھا کہ جو کام ھوا وھوس کے قریب ہوتا اس کی مخالفت کرتے ہوئے اسے چھوڑ دیتا کہا جاتا ہے کہ یہ معیار بہت معتبر ہے کیونکہ جو کام تمہیں زیادہ مشکل سے دوچار کرے وہ تمہیں زیادہ طاقت بھی دے گا اور تمہیں اعلی اقدار کی طرف لے جائے گا۔

(ج) : عملی اصول (برات ،استصحاب، احتیاط، تخییر)

مومن کسی وقت بھی مایوس نہیں ہوتا کیونکہ اگر وہ مقام عمل میں متردد ہو جائے تو ایسی صورت میں اصول عملیہ اس کی راہنمائی کرتی ہیں اور یہ اسلامی اصولوں کی عظیم ترین نعمتیں ہیں جن سے ہم واقف ہیں کیونکہ ان کی عظمت کو نہیں سمجھتے اور صرف ان کا احکام میں ہی استفادہ کرتے ہیں۔

۳۔ عملی مشکلات

کتاب اور میزان کے بعد عمل کے میدان میں عملی مشکلات کی طرف توجہ کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ ایک منتظر مومن کے لئے ممکن ہے کہ اسے عملی میدان میں کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے اور وہ تمام کمالات جو اس نے کمائے ہیں شیطان کی طرح ایک ہی دفعہ ہاتھ سے کھو بیٹھے لہٰذا اس لئے کہ منتظر اس مرحلے میں مشکلات اور آفات سے محفوظ رہے کچھ نکات کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔

۱۔ بحار الانوار ج ۷۰ ص ۱۹۱ مجمع البحرین ج ۴ ص ۱۶

۲۔ نہج البلاغہ کلمات حکمت ۲۸۹

۱۔اس کے عمل کی بنیاد دیکھا دیکھی اور ماحول کے اثرات کے تابع نہ ہو بلکہ اس کے عمل کی بنیاد یہ ہو کہ گویا وہ جنت و دوزخ کو دیکھ رہا ہے **(مومن شغل من الجنة والنار امامه)**[۱]

اس کا ہر لفظ اور ہر حرکت اسے جنت یا جہنم لے جاسکتی ہے اس معرفت کے ساتھ جب وہ مرحلہ عمل میں قدم رکھے گا تو پھر کسی آفت سے بھلائی کی توقع اور دوسروں کی خوشنودی سے آزاد ہو کر ایثار کی بنیاد پر حرکت کرے گا اور ہمیشہ اپنے آپ کو مدیون بھی سمجھے گا۔

۲۔منتظر مومن اپنے عمل کے حجم اور مقدار کو نہ دیکھے بلکہ اپنی توانائی کو دیکھے اور توانائی کے ترازو میں اسے تولے نہ اپنی کمائی کے ترازو میں، کیونکہ **(لیس للانسان الا ماسعی)**[۲]

عمل کی خصوصیات سے آگاہی کی ذریعہ (یعنی اچھے کاموں کو زیادہ کرنا اور برے کاموں کو کم دیکھنا) خلاصی حاصل کی جاسکتی ہے کیونکہ وہ بھلائی جسے تم زیادہ دیکھ رہے ہو وہ عقیم اور بانجھ کی طرح ہے اور وہ برائی جسے تم تھوڑا سمجھتے ہو وہ بڑھ سکتی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس کے برعکس سوچا جائے تاکہ بھلائیاں زیادہ کی جاسکیں اور برائیوں کو عقیم اور بانجھ کیا جاسکے۔

(واستقلال الخیر وان کثر من قولی و فعلی و استکثار الشر وان قل من قولی و فعلی)[۳]

۳۔منتظر شخص کا عمل زمانہ اور مقام سے تناسب رکھتا ہو کیونکہ یہ بات ٹھیک ہے کہ توابین نے اپنے خون کو امام حسین (ع) کی راہ میں بہایا لیکن اگر یہی خون تاسوعا (نویں محرم) کے دن امام حسین تک پہنچ جاتا تو شاید عاشورہ کا واقعہ پیش ہی نہ آتا **(سارعوا الی مغفرة من ربکم)**[۴]

۴۔منتظر افراط و تفریط سے باز رہے اور اسے سنت سے علیحدہ نہیں ہونا چاہئے **(لانیة الا باصابة السنة)**[۵]

---

۱ ۔ نہج البلاغہ خ ۱۶

۲ ۔ نجم ۳۲

۳ ۔ مفاتیح الجنان دعائے مکارم اخلاق

۴ ۔ آل عمران ۱۳۳

۵ ۔ تحف العقول ص ۴۳

۵۔منتظر شخص کے عمل کا مقصد اور جہت معین ہونی چاہئے (**من ابدی صفحته للحق هلک**)[۱]
جو بھی حق کے مقابلے میں حرکت کرے گا وہ برباد ہو جائے گا۔
۶۔منتظر شخص کو اپنے ظاہری اعمال پر مغرور نہیں ہونا چاہئے کیونکہ عمل کی اہمیت اس کی نیت کے مطابق ہے:
(**حاسبوا قبل ان تحاسبوا**)[۲]
یعنی تم اپنا محاسبہ کرلو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے یہ نہیں کہا کہ حاسبوا اعمالکم مراد یہ ہے کہ اپنی نیتوں کا محاسبہ کرو۔
یہ وہ مختصر سے پہلو تھے جن کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کروائی گئی ہے تاکہ ہم ان امور کی طرف توجہ کرنے سے حقیقی انتظار کی راہ پر گامزن ہو سکیں اور اپنے اندر وہ تمام صفات پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکیں جنہیں اللہ تعالی اور اس کے اولیاء نے ہم سے طلب کیا ہے۔

۱۔ نہج البلاغہ خ۱۶ سطر ۶
۲۔ نہج البلاغہ خ ۹۰ سطر ۸

مصادر

۱. قرآن کریم
۲. نہج البلاغہ
۳. مفاتیح الجنان، شیخ عباس قمی، ترجمہ اردو، مترجم حافظ ریاض حسین نجفی، مصباح القرآن ٹرسٹ۔
۴. تحف العقول عن آل رسول، ابن شعبہ حرانی، حسن بن علی، مترجم: صادق حسن زادہ، قم، ایران
۵. بحار الانوار، علامہ محمد باقر مجلسی، مترجم: موسی خسروی، کتابفروشی اسلامیہ،
٦. مجمع البحرین، مخرالدین طریحی، تحقیق: احمد الحسینی، موسسہ التاریخ العربی، بیروت لبنان
۷. ریاض السالکین فی شرح صحیفۃ سید الساجدین الامام علی بن الحسین، سید علی خان مدنی، جامعہ المدرسین قم، ۱۳۹۸
۸. تفسیر صافی، محمد محسن فیض کاشانی، عبدالرحیم عقیقی بخشایشی، انتشارات نوید اسلام
۹. الغیبۃ، شیخ ابی جعفر محمد بن الحسن طوسی، موسسہ المعارف الاسلامیہ
۱۰. نہج الفصاحۃ کلمات قصار رسول اکرم، ابوالقاسم پایندہ، مصحح، غلامحسین المجیدی، انتشارات جاویدان، ۱۳۹۰
۱۱. شرح اصول کافی، السید جعفر الحسینی الشیرازی، دار العلوم، چاپ اول۔، ۲۰۱۰ء
۱۲. عیون اخبار الرضا، شیخ صدوق، انتشارات جہان، ۱۳۷۸

فریقین کی روایات اور ادلہ کی روشنی میں: عول اور تعصیب کا بطلان

سید محمد غضنفر فائزی[1]

خلاصہ

صدر اسلام سے آج تک مکتب خلفا کے طرف دار «اہل سنت» اور اہل بیت کے طرف داروں میں بہت سارے کلامی عقیدتی اور فقہی مسائل میں اختلاف پایا جاتا ہے مثلا متعہ کا جواز یا حرمت، مسئلہ طلاق ثلاثہ، اور میراث کے باب میں عول اور تعصیب کا مسئلہ ہے۔ عول کا معنی یہ ہے کہ اگر میراث کے حصے وارثوں کے حصوں سے کم ہوں تو سب کو برابر کم دیا جائے اور تعصیب کا مطلب یہ ہے کہ اگر میراث کا کچھ حصہ وارثوں کے حصوں سے بچ جائے تو وہ دوسرے طبقہ کے وارثوں کو دے دیا جائے۔ اس مقالہ میں اس بات کو ثابت کیا گیا ہے کہ سب سے پہلے عول اور تعصیب کا فتوی دوسرے خلیفہ حضرت عمر (حکومت ۱۳۔ ۲۳ھ) نے دیا تھا اور مقالہ میں فریقین کے اصلی ترین مصادر سے ادلہ کو ذکر کیا گیا ہے اور ان کے بارے میں سندی اور دلالی جہات سے بحث کی گئی ہے اور اس بات کو ثابت کیا گیا ہے کہ عول و تعصیب کا نظریہ قطعی طور پر نص قرآن کے خلاف ہے۔

بنیادی کلمات: قرآن، سنت، میراث، عول، تعصیب

---

[1] استاد المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی قم

تمہید

اولاد کا اپنے والدین سے میراث پانا مسلمات بشری میں سے ہے کفار بھی اولاد کو والدین کے تمام اموال کا وارث مانتے ہیں اور یہ مسئلہ اسلام میں ضروریات دین میں سے ہے۔

قرآن کریم میں میراث کے بارے میں گیارہ آیات آئی ہیں جن میں تین قسم کی تعبیرات بہت اہم ہیں۔

پہلی تعبیر: لفظ وصیت: وصیت کے بارے میں پہلی تعبیر یوں ہے (يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ)[۱] اللہ تعالی تمہیں وصیت کرتا ہے اولاد کی میراث کے بارے میں، بیٹوں کا میراث میں حصہ بیٹیوں سے دو برابر ہے۔

وصیت کا لفظ میراث کے مسئلہ کی انتہائی اہمیت پر دلالت کرتا ہے چونکہ عام انسان کی وصیت میں تغییر دینا مطلّقا حرام ہے تو جس چیز کے بارے میں خود اللہ نے وصیت کی ہو اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا کیا حکم ہوگا؟

دوسری تعبیر: حدود اللہ، سورہ نساء کی آیت نمبر ۱۱ و ۱۲ میں تفصیل سے اللہ رب العزت نے میراث کے مسائل کو بیان فرما کر ان کو اللہ کی وصیت سے تعبیر فرمایا ہے۔ پھر اس کے بعد تیرہویں اور چودھویں آیت میں میراث کو حدود اللہ سے تعبیر فرمایا اور حدود اللہ کو توڑنے والوں کو ذلت آور ابدی عذاب کی دھمکی دی ہے۔

۱۔ سورہ نساء، آیت ۱۱

تِلْکَ حُدُودُ اللّهِ وَ مَنْ يُطِعِ اللّهَ وَ رَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ * وَ مَنْ يَعْصِ اللّهَ وَ رَسُولَهُ وَ يَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَاراً خَالِداً فِيهَا وَ لَهُ عَذَابٌ مُهِينٌ

ان دو آیات کو پڑھ کر بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے اللہ نے وصیت کے مسائل میں تغییر و تحول کو حدود الٰہی توڑنے سے تعبیر فرمایا ہے اور حدود الٰہی توڑنے والوں کو ابدی عذاب کی سخت ترین دھمکی دی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ سورہ نساء کی آخری آیت میں اس آیت کی تصریح اور نص موجود ہے کہ طبقہ ثانیہ (میت کے بھائی بہنیں اور دادا دادی وغیرہ) کو صرف اس صورت میں ارث میں سے حصہ ملے گا جب میت کی اولاد نہ ہو یعنی اگر اولاد ہو تو ان کو ہر گز حصہ نہیں ملے گا۔اور آیت میں تصریح ہے کہ طبقہ ثانیہ کو طبقہ اول کے ایک فرد کی موجودگی میں ہر گز کچھ نہیں ملے گا۔

تیسری تعبیر: لفظ فتوی: اللہ رب العزت نے میراث کے مسائل کو اپنے فتوی کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔یعنی یہ میرا آخری فیصلہ ہے جس میں کسی قسم کی ترمیم اور تغییر ممکن نہیں۔

يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلاَلَةِ إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ وَهُوَ يَرِثُهَآ إِن لَّمْ يَكُن لَّهَا وَلَدٌ فَإِن كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ وَإِن كَانُواْ إِخْوَةً رِّجَالاً وَنِسَاء فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الأُنثَيَيْنِ يُبَيِّنُ اللّهُ لَكُمْ أَن تَضِلُّواْ وَاللّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ [1]

ان تین تعبیرات کو دیکھ کر کوئی اہل ایمان وصیت کے مسائل میں دخل و تصرف کرنے کی سوچ بھی نہیں سکتا۔

۱۔ سورہ نساء، آیت ۱۷۶

مختصر احکام میراث

اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں میراث کے حصوں کو یوں بیان فرمایا ہے۔

۱/۲، ۱/۳، ۱/۴، ۱/۶، ۱/۸، ۲/۳

اور ان حصوں کے حق دار ۱۵ قسم کے لوگوں کو بیان فرمایا مثلا اگر بیوی کی اولاد ہو تو شوہر کے لیے ۱/۴ ورنہ شوہر کا ۱/۲ حصہ ہوگا اور اگر شوہر کی اولاد ہو تو بیوی کے لیے ۱/۸ اور نہ ہو تو اس کا ۱/۴ حصہ ہوگا۔

اور اللہ رب العزت نے جب یہ حصے بیان فرمائے تو اللہ کو معلوم تھا کہ میراث کے حصہ داروں کے حصوں میں تداخل ہوگا۔ پھر بھی اللہ رب العزت نے تقسیم کو لوگوں کی سوچ بوجھ پر نہیں چھوڑا، بلکہ خود تعیین فرمایا کہ کس کو کیا دیا جائے۔

اگر وارثوں میں تداخل نہ ہو تو یہ حصے تو بہت آسانی سے قابل تقسیم ہیں، مثلا اگر کسی شخص کے ۶ وارث ہوں ،والدین اور چار بیٹے تو میراث کے چھ حصے کریں گے، اور ہر ایک کو ایک ایک حصہ مل جائے گا مثلا اگر میراث ۶۰۰ ہو تو ہر ایک کو سو سو مل جائے گا۔

یا اگر کوئی عورت مر جائے اور اس کی وارث صرف ایک بہن اور شوہر ہو تو بہن کو نصف مل جائے گا اور شوہر کو نصف مل جائے گا اور میراث تمام ہو جائے گی۔

اسی طرح اگر کوئی شخص مر جائے اور اس کی وارث کئی بیٹیاں اور والدین ہوں تو حکم اللہ کے مطابق بیٹیوں کو ۲/۳ یعنی چھ حصوں میں سے چار حصے ملیں گے اور والدین کو ایک ایک حصہ ملے گا مجموعا چھ حصے تمام ہو جائیں گے۔

لیکن بعض صورتوں میں وارثوں کا حصہ کم ہوتا ہے اور میراث زیادہ ہو جاتی ہے اور کبھی اس کے بر عکس وارثوں کا حصہ زیادہ بن جاتا ہے لیکن میراث کے تعیین شدہ چھ حصے کرنے سے میراث کم ہو جاتی ہے کیا اللہ جس نے

میراث کے احکام کو اتنی سختی سے بیان کیا ہے ،وہ اس صورت کو (نعوذ باللہ) نہیں جانتا تھا؟وہ اللہ جو (يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ)[1] اور (عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهٰدَةِ)[2] ہے کیااس کو ان دو صورتوں کا علم نہیں تھا۔

صدر اسلام سے حکومتی اسلام اور اسلام ناب محمدیؐ کے علمی ٹکراؤکے بہت سارے نمونے ہیں جن میں ایک اہم موضوع یہی دو مسئلے ہیں جن کو عول اور تعصیب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

عول کی تعریف

عول کا معنی اوپر جانا یا ظلم ہے چونکہ بعض صورتوں میں وارثوں کے حصے اصل میراث سے زیادہ ہو جاتے ہیں،مثلاً اگر کوئی عورت فوت ہو جائے اور اس کی وارث چند بہنیں ہوں توان کا حصہ ۳/۲ بنتا ہے اور چونکہ اس کی اولاد نہیں تھی لہٰذا اس کے شوہر کا حصہ نصف ہوتا ہے ۲/۱ تو اس صورت میں چھ میں سے ۳/۲ چار حصہ بنتے ہیں اور چھ میں نصف تین حصے بنتے ہیں تو میراث کے چھ حصے ہوتے ہیں اور وارثوں کے حصے سات بن جاتے ہیں لہٰذا میراث کم ہو جائے گی۔

یہ مسئلہ خلیفہ عمر کے زمانے میں پیش آیا خلیفہ عمر نے صحابہ سے سوال کیا اس صورت میں کیا کیا جائے؟

صحابہ نے مشورہ دیا کہ سب کے حصے میں سے کم دیا جائے تاکہ نقص سب پر برابر ہو جائے یعنی شوہر کو ۷/۲ دیں گے اور بہنوں کو ۷/۴ دیں گے تو اس صورت میں سب کو حصے میں برابر کم ہوگا اور کسی پر ظلم لازم نہیں آئے گا۔

۱۔ سورہ سجدہ، آیت ۵

۲۔ سورہ سجدہ، آیت ۶

لیکن اہل بیت اور ان کے شیعوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ (عول) باطل ہے اور سارا کا سارا نقص بہنوں کے حصے میں ہوگا۔ شوہر کو پورا حصہ دیا جائے یعنی اس صورت میں شوہر کو نصف ملے گا اور بہنوں کو بھی نصف ملے گا۔
اور جس مورد میں بھی عول لازم آتا ہے وہاں نقص بیٹی یا بیٹیوں یا بہن اور بہنوں کے حصہ کم دیا جائے گا۔ شوہر یا بیوی یا ماں یا مادری بہن بھائیوں کے حصے میں کمی نہیں کی جائے گی۔
تذکر: عول صرف اس صورت میں لازم آتا ہے جہاں وارثوں کے ساتھ شوہر یا بیوی بھی موجود ہوں۔
دونوں فریقوں نے اپنے نظریے کی صحت کے ادلہ اقامہ کی ہیں ہم یہاں مختصر طور پر دونوں کی ادلہ اور ان کے اوپر ہونے والے اشکالات کو بیان کرتے ہیں۔

بطلان عول پر امامیہ کی دلیلیں

۱۔ اگر اللہ رب العزت میراث میں ۲/۳ اور نصف کو قرار دے تو یہ محال ہے چونکہ اس صورت میں اللہ کا جاہل ہونا لازم آتا ہے۔ نعوذ باللہ، اللہ کو علم نہیں ہوا کہ یہ حصے میراث سے زیادہ بنتے ہیں۔ اور اللہ تعالی کے لیے جہالت کو تصور کرنا بھی محال ہے۔

شیخ طوسی (متوفی ۴۶۰ھ) نے یہ اشکال جناب فضل بن شاذان (متوفی ۲۶۰ھ) سے یوں بیان کیا ہے۔

اگر میت کے وارثوں میں شوہر اور والدین اور دو بیٹیاں ہوں تو بیٹیوں کے دو تہائی (۲/۳) اور شوہر کا ۱/۴ اور والدین کے ۲/۶ تو اس صورت میں میراث سے ۱/۴ زیادہ ہو جائے گا۔ اور یہ تصور کرنا کہ اللہ نے میراث کے حصوں سے میراث کے طلب گاروں کا حصہ زیادہ قرار دیا ہے۔ یہ تناقض اور محال ہے کہ اللہ رب العزت کو حساب نہیں تھا سہم کتنے ہیں اور میراث کے حصے کتنے ہیں۔

پھر جناب فضل بن شاذان (متوفی ۲۶۰ھ) نے اس قسم کے ۱۳ اور نمونے ذکر کیے ہیں۔

پھر فرماتے ہیں ہمارے مذہب کے مطابق یہاں بیٹیوں کا کوئی معین حصہ نہیں ہے ورنہ محال لازم آئے گا بلکہ شوہر کو ۱/۴ اور والدین کو ۲/۶ دیں گے مثلاً ۶۰۰ میں سے شوہر کو ۱۵۰ اور والدین کو ۱۰۰، ۱۰۰ مجموعاً ۳۵۰ اور باقی ۲۵۰ بیٹیوں کے لیے ہوگا۔[۱]

عول کے بارے میں اہل بیت کی روایات کی تفصیل

تقریباً صدر اسلام سے اہل بیت کی اتباع کرتے ہوئے علمائے شیعہ عول و تعصیب کے بطلان کی تحقیق کو اپنی کتب میں نقل کرتے آئے ہیں حتی کہ جن محدثین نے صرف احادیث کو نقل کیا ہے انہوں نے بھی اس موضوع پر تحقیق اور توضیح کو ضروری سمجھا ہے۔

اصول کافی میں محمد بن یعقوب کلینی (متوفی ۳۲۹ھ بغداد) نے ۱۴ روایات اہل بیت سے نقل کی ہیں جن میں عول کے بطلان کو بیان کیا گیا ہے۔ محمد بن یعقوب کلینی[۲] اور تعصیب کے بطلان پر دو احادیث بیان کی ہیں۔[۳] اس کے ساتھ ساتھ مرحوم کلینی نے کافی کی جلد نمبر ۷ میں کتاب مواریث کی ابتدا میں چار صفحے عول و تعصیب کے بطلان پر لکھا ہے۔[۴]

شیخ محمد بن حسن طوسی (متوفی نجف ۴۶۰ھ) نے تہذیب احکام میں عول اور تعصیب کے بطلان کے بارے میں ۱۶ روایات کو ذکر کیا ہے جن میں ۱۴ عول کے بارے میں ہیں اور دو تعصیب کے بارے میں ہیں۔ شیخ نے یہ سب

۱۔ شیخ طوسی: التھذیب، ج۹، ص ۲۵۴، ۲۵۱

۲۔ اصول کافی ۷/۸۷-۸۲

۳۔ کافی ۷/۷۵

۴۔ کافی ۷/۷۲-۷۵

روایات کافی سے نقل کی ہیں پھر عول کے بارے میں فضل بن شاذان (متوفی ۲۶۰ھ) سے تحقیقی جواب کو نقل کیا ہے۔[۱]

بحار الانوار طبع بیروت میں ۲۰ روایات عول و تعصیب کے بطلان کے بارے میں نقل ہیں۔[۲]

وسائل شیعہ کی جلد نمبر ۲۶ میں کتاب الفرائض والمواریث میں دو باب بطلان عول کے بارے میں ہیں (باب ۶، ۷) جن میں مجموعا ۲۴/احادیث ہیں۔ اور ایک باب (باب ۸) بطلان تعصیب کے بارے میں ہے، جس میں گیارہ احادیث کو نقل کیا ہے۔

عول کے بطلان کے بارے میں روایت

۱۔ مرحوم کلینی (محمد بن یعقوب) نے اصول کافی میں محمد بن اسماعیل سے، اس نے فضل بن شاذان سے، اس نے محمد بن یحییٰ سے، اس نے علی بن عبداللہ سے، اس نے ابراہیم سے، اس نے اپنے باپ سے، اس نے محمد بن اسحاق سے، اس نے زہری سے، اس نے عبیداللہ بن عبداللہ سے۔

۲۔ جصّاص (متوفی ۳۷۵ھ) نے احکام القرآن میں ابن مسعود سے۔

۳۔ شیخ صدوق (۳۸۱ھ) نے علل الشرائع اور الفقیہ میں۔

۴۔ حاکم متوفی (۴۰۵ھ) نے مستدرک حاکم میں اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

۵۔ اور ابو الحسن ماوردی بصری (متوفی ۴۵۰ھ) نے الحاوی الکبیر میں۔

۶۔ بیہقی متوفی (۴۵۶ھ) السنن الکبری میں۔

۷۔ شیخ طوسی (متوفی ۴۶۰ھ) نے تھذیب الاحکام میں۔

۱۔ شیخ طوسی محمد بن حسن التھذیب ج ۹/ ۲۴۷ــ۲۶۸ تک

۲۔ بحار الانوار، ج ۱۰۱/ ۳۲۸ــ۳۳۸

۸۔ شمس الائمہ سرخسی (متوفی ۴۸۳ھ) نے المبسوط میں۔

۹۔ ابن رشد قرطی متوفی (۵۹۵ھ) نے بدایۃ المجتہد و نہایۃ المقتصد میں۔

۱۰۔ابن قدامہ مقدسی (متوفی ۶۲۰ھ) نے المغنی میں۔

۱۱۔ابن کثیر دمشقی (متوفی ۷۷۴ھ) نے مسند االفاروق میں۔

۱۲۔ابو ہلال عسکری (متوفی ۔۔ھ) نے الاوئل میں۔

۱۳۔جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) نے تاریخ الخلفا میں۔

سب نے محمد بن اسحاق مدنی (متوفی ۱۵۰ھ) سے ،اس نے زہری (متوفی ۱۲۴ھ)،اس نے عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود ھذلی سے نقل کیا ہے کہ: میں ،زفر بن اوس بن حدثان بصری کے ساتھ ابن عباس کے پاس گیا اس وقت ان کی آنکھیں اندھی ہو چکی تھی۔

میں نے کہا: اے ابوالعباس! کس نے میراث کے حصوں میں عول کا حکم دیا۔انہوں نے کہا: عمر بن خطاب نے کیونکہ اس کے پاس میراث کے متعدد حصے دار آئے اور وہ ایک دوسرے میں تداخل رکھتے تھے تو عمر نے کہا: اللہ کی قسم میں نہیں جانتا کہ تم میں کس کو اللہ نے مقدم کیا ہے تاکہ اس کو مقدم کروں۔اور کس کو موخر کیا ہے تاکہ اس کو موخر کروں۔

لہٰذا میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ تم میں مال کو اس طرح تقسیم کروں کہ سب کا نقصان برابر ہو (یعنی عول کے ساتھ تقسیم کروں) پھر ابن عباس نے کہا: اللہ کی قسم جس کو اللہ نے مقدم کیا ہے، عمر اس کو مقدم کرتا اور جس کو موخر کیا ہے اس کو موخر کرتا تو ہرگز میراث کی تقسیم میں عول (حق دار کے حق کو کم دینے) میں گرفتار نہ ہوتا۔

زفر نے کہا: اللہ نے کس کو مقدم کیا ہے اور کس کو موخر کیا ہے؟

ابن عباس نے کہا: جس کا فریضہ کم و زیاد ہوتا ہے ان کو مقدم کیا ہے مثلاً شوہر کو نصف ملتا ہے لیکن اگر اولاد ہو تو ۱/۴ ملتا ہے۔ بیوی کو ۱/۴ ملتا ہے لیکن اگر میت کی اولاد ہو تو ۱/۸ ملتا ہے۔ بہنوں کو دو تہائی ملتا ہے لیکن اگر ایک ہو تو اس کو نصف ملتا ہے۔ تو یہ مقدم ہیں ان کے لیے کم سے کم حد کو اللہ نے مقرر کر دیا ہے اس سے نیچے لانا جائز نہیں ہے۔ تو یہ لوگ میراث کے حصوں میں مقدم ہیں ان کو اس مقدار سے کم کرنا جائز نہیں۔ لھذا اگر میراث کا حصہ کم ہو تو ان کے حصے سے کم نہیں کیا جائے گا ان کے علاوہ کو کم کیا جائے گا اور یہ مقدم ہوں گے۔

زفر نے کہا: تم نے عمر کو اس بات کی طرف کیوں توجہ نہ دلائی۔

ابن عباس نے کہا: اس کی ہیبت اور خوف اس بات سے مانع ہوائی۔

اس روایت کی صحت میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے چونکہ سب شیعہ اور سنی علما اور محدثین نے اس کو ذکر کیا ہے اگرچہ اصول کافی میں ہی ہونا اس کی صحت کے لیے کافی تھا لیکن الحمد للہ علما اہل سنت نے بھی اس کی صحت کی تائید کی ہے بعض نے اس بات کو خلیفہ عمر کے افتخارات میں سے قرار دیا ہے کہ سب سے پہلے عمر نے فرائض میں کمی کر کے (عول) کی بنیاد رکھی اور حقیقت بھی یہی ہے لہٰذا جنہوں نے اس کو رسول اللہ کی طرف نسبت دینے کی کوشش کی ہے وہ کذب محض ہے۔

ابن عباس عول کے مسئلہ میں اس قدر شدت سے مخالف تھے کہ اعلان کرتے تھے جو بھی عول کے مسئلہ میں میرے ساتھ چاہے میں حجر اسود کے پاس مباہلہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ و قال فی العول : من شاء باھلتہ عند الحجر الاسود۔[1]

۱۔ الحاوی الکبیر ماوردی بغدادی ۱۶، ۱۲۹

اور فقہاء اہل سنت بحث اجماع میں ایک شخص کی مخالفت کو مانع اجماع قرار دیتے ہیں اور اس کی مثال ابن عباس کی مسئلہ عول میں مخالفت کو قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا ماوردی نے احمد بن حنبل کے اس کلام کو کہ ایک آدمی کی مخالفت، اجماع کے لیے مضر نہیں ہے، کو فاسد قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ایک آدمی کی مخالفت بھی مانع اجماع ہے۔ ہو سکتا ہے حق اس کے ساتھ ہو۔ پھر اس کی تائید کے لیے ذکر کیا ہے کہ سب صحابہ کا اجماع تھا کہ اہل ردہ سے جہاد نہ کیا جائے اس میں صرف ابو بکر نے مخالفت کی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ابو بکر کی رائے صحیح تھی۔ لہٰذا یہاں ابن عباس کی مخالفت بھی اجماع کے انعقاد کے لیے مانع ہے۔

پس عول کے نظریے پر نہ اجماع امت ہے اور نہ کسی شرعی دلیل سے اس کا جواز ثابت ہے، بلکہ یہ نظریہ خلیفہ عمر کی ذاتی رائے تھی۔ لہٰذا یہ نظریہ احکام میراث میں قطعاً تحریف اور حکم اللہ کی قطعی مخالفت شمار ہوگی۔

تعصیب کی تعریف

لفظ تعصیب عصبہ سے لیا گیا ہے جس کا معنی خاندان ہوتا ہے۔ یہاں اہل سنت کی مراد یہ ہے کہ اگر میراث کا کوئی حصہ طبقہ اول کے وارثوں سے زیادہ ہو جائے تو اس کو طبقہ دوم کے وارثوں میں صرف مردوں کو دیا جائے۔

مثلاً ایک آدمی مر جائے اور اس کے وارث صرف ایک بیٹی اور والدین ہوں تو بیٹی کو نصف میراث ملتی ہے اور والدین کو چھٹا حصہ ملتا ہے تو اس صورت میں بیٹی کو چھ میں تین اور والدین کو ایک ایک، جو کہ پانچ حصہ بنتے ہیں۔ اور ایک حصہ اضافہ ہو جاتا ہے مثلاً ۶۰۰ میراث ہو تو بیٹی کو ۳۰۰، اور والد کو ۱۰۰، اور والدہ کو ۱۰۰ حصے۔ اور سو اضافی ہوگا۔

اہل سنت کے نظریہ کے مطابق یہ سو روپیہ دوسرے طبقہ کے مردوں کو دیا جائے گا، عورتوں کو کچھ نہیں ملے گا۔ لہٰذا اگر میت کا ایک بھائی بھی ہو اور ایک بہن بھی یا صرف چچا اور پھوپھی ہوں تو یہ سو روپیہ بھائی کو یا چچا کو دیا جائے گا، بہن اور پھوپھی کو کچھ نہیں ملے گا۔

لیکن امامیہ کی نظر میں طبقہ اول اولاد اور والدین کے ہوتے ہوئے طبقہ دوم بھائی، بہنیں، چچا، پھوپھیاں، ماموں، خالہ وغیرہ کو کچھ نہیں ملے گا۔ بلکہ اوپر والی مثال میں اضافی سو روپیہ پھر طبقہ اول کے وارثوں کو دے دیا جائے گا۔ جتنا ان کا میراث میں حصہ ہے اتنا اس سو روپے سے ملے گا۔ بیٹی کا حصہ ۳، والدین کا ۱،۱ مجموعاً ۵ حصے بنتے ہیں اور اس سو روپے کو ۵ حصوں میں تقسیم کریں گے۔ بیٹی کو ٦۰ اور والد کو ۲۰ اور والدہ کو ۲۰ مل جائیں گے۔

اسی طرح بیٹی کو کل میراث میں سے ۳٦۰ اور والد کو ۱۲۰ اور والدہ کو بھی ۱۲۰ ملیں گے۔ یعنی بیٹی کو بھی میراث ۵/۳ اور والد کو ۵/۱ والدہ کو بھی ۵/۱ ملے گا۔ اصل فریضہ میں حصہ ۱۰۰ بنتا تھا اور اضافی حصہ ملنے سے ۱۲۰ ملیں گے۔

امامیہ کا اس بات پر اجماع قطعی ہے کہ طبقہ اول کے ہوتے ہوئے طبقہ دوم کو مطلّقا کچھ بھی نہیں ملے گا۔ اضافی مال دوبارہ انہیں میں تقسیم کیا جائے گا۔ دونوں فریقوں نے اپنے اپنے مدعی پر ادلہ اقامہ کی ہیں۔

تعصیب کے بارے میں اہل سنت کی ادلہ

پہلی دلیل

اہل سنت نے میراث کے زائد حصے کو طبقہ دوم یا سوم کے وارثوں کو دینے پر کئی ادلہ قائم کی ہیں۔

اول: اللہ رب العزت نے سورہ نساء کی آیت نمبر ۱۷٦ میں بیان فرمایا ہے اگر کوئی شخص مر جائے اور اس کی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن ہو تو اس کو میراث کا نصف ملے گا لیکن اگر بہن مر جائے اور اس کی اولاد نہ ہو اور صرف ایک بھائی ہو تو پورا مال اس کو ملے گا۔

یَسۡتَفۡتُونَکَ قُلِ اللّٰہُ یُفۡتِیکُمۡ فِي الۡکَلَالَۃِ إِنِ امۡرُؤٌ ہَلَکَ لَیۡسَ لَہُ وَلَدٌ وَ لَہُ أُخۡتٌ فَلَہَا نِصۡفُ مَا تَرَکَ وَ ہُوَ یَرِثُہَا إِنۡ لَمۡ یَکُنۡ لَہَا وَلَدٌ۔

وجہ استدلال یہ ہے کہ اگر بہن کو نصف کے بعد باقی نصف بھی ملنا ہوتا تو بہن اور بھائی میں کوئی فرق نہیں تھا ۔جیسے اللہ تعالی بیان فرما دیتا ہے کہ بہن کو بھائی کی پوری میراث ملے گی جس طرح یہ بیان فرما دیا ہے کہ بھائی کو بہن کی پوری میراث ملے گی۔اگر بہن کو بھی پوری میراث دینا واجب ہے تو بہن اور بھائی کے حکم میں فرق بیان کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

پہلی دلیل کا جواب

علمائے شیعہ قدیم الایام سے اس کا جواب دیتے ہیں۔

اولا: یہ دلیل اس صورت میں تمام ہوتی کہ ہم لقب کے لیے بھی مفہوم کے قائل ہوں حالانکہ علماء اصول شیعہ و سنی سب لقب کے لیے مفہوم کے قائل نہیں ہیں اور اس کو اضعف المفاہیم قرار دیتے ہیں۔

توضیح یوں ہے جن کے لیے اللہ رب العزت نے نام لے کر ایک فریضہ اور حصہ بیان کیا ہے مثلا بہن کے لیے نصف فریضہ اور حصہ ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کو زیادہ دینا جائز نہیں ہے۔ہاں اگر لقب کے لیے مفہوم کے قائل ہوں تو پھر یہ استدلال جائز ہوگا۔

ثانیا: اگر فریضہ اور حصہ کو معین کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہو کہ اس کو صرف اتنا ہی دینا جائز ہے زیادہ دینا جائز نہیں تو عول کی صورت میں اہل سنت فریضہ معینہ سے اس کے حصے کو کم کیوں کرتے ہیں ؟چونکہ اگر میراث کم ہو جائے تو اہل سنت سب وارثوں کے فریضے میں کمی کر کے سب کو اپنے حصے سے کم دیتے ہیں جس کو عول کہتے

ہیں تو اگر لفظ فریضہ اور حصہ معینہ آنے کی وجہ سے اس کو زیادہ جائز نہیں لہٰذا زائد باقی وارثوں کو دیں گے تو پھر فریضہ معینہ سے کم کرنا کیوں جائز ہے؟

ثالثا: اگر آیہ فریضہ کو مان لیں کہ وہ بیان کرتی ہے کہ بہن کو صرف نصف دیا جائے اس سے زیادہ دینا جائز نہیں تو اس آیت کا آیہ اولوالارحام سے تعارض ہو جائے گا۔ چونکہ مازاد کے بارے میں آیہ اولوالارحام کے مطابق وارث اقرب کو اولویت حاصل ہے۔ جبکہ آیہ فریضہ کہتی ہے مازاد اس کو نہیں ملنا چاہے اگر ان میں تعارض ہو جائے۔ لیکن اگر مازاد، اقرب (قریبی رشتہ دار جو صاحب فریضہ ہے مثلا بہن یا طبقہ اول والے) کو دے دیا جائے تو اس میں دونوں آیات میں جمع حاصل ہو جائے گا۔ اور تعارض برطرف ہو جائے گا۔

آیہ اولواالارحام: وَ أُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللهِ[1] میں بیان اولویت سے مراد اولویت تعیینی ہے نہ کہ ترجیحی۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ کوئی مسلمان بھی طبقہ اول کے ہوتے ہوئے طبقہ ثانیہ کی میراث کا قائل نہیں۔ جھگڑا صرف اس صورت میں ہے کہ طبقہ اول کے وارثوں کے حصے اگر کم ہوں تو پھر اس صورت میں آیہ اولوالارحام پر عمل کرنا لازم ہے یا نہیں اور مازاد بھی طبقہ اول کو ہی دیا جائے گا یا نہیں۔

امامیہ کہتے ہیں اس صورت میں بھی تعیینی ہے اور جبکہ اہل سنت اور خلفا کے طرف دار کہتے ہیں کہ اس صورت میں روایات کی وجہ سے اس پر عمل لازم نہیں بلکہ مازاد طبقہ دوم کو دیں گے۔

مثلا اگر میت کے والدین ہوں اور چار بیٹے تو پوری میراث طبقہ اول کو ہی دیں گے ایک ایک حصہ والدین کو اور باقی چار بیٹوں کو اور طبقہ ثانیہ کو قطعاً کچھ نہیں ملے گا۔

۱۔ سورہ احزاب، آیت ۶

لیکن اہل سنت کے نظریے کے مطابق اگر طبقہ اول میں والدین اور ایک بیٹی ہو تو بیٹی کا نصف یعنی تین حصے اور والدین کے دو حصے بنتے ہیں اور ایک حصہ اضافی ہو جاتا ہے تو یہ حصہ دوسرے طبقے کو دیں گے جس کو تعصیب کہتے ہیں۔

دوسری دلیل: تعصیب کے بارے میں احادیث اہل سنت

پہلی روایت

ا۔ اہل سنت کے محدثین بخاری، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ وغیرہ نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ رسول اکرم نے فرمایا "فرائض میں سے جو مال اضافہ ہو وہ میت کے دیگر رشتہ داروں میں مردوں کو دیا جائے "ما ابقت الفرائض فلاولی عصبۃ ذکر"

اور دوسری عبارت یوں ہے "ما ابقت الفرائض فلاولی رجل ذکر عصبة"

روایت کی سند یوں ہے۔ "وهيب عن عبدالله بن طاووس عن ابيه عن ابن عباس قال قال رسول الله۔"

روایت کا جواب

شیخ طوسی (متوفی ۴۶۰ھ نجف) فضل بن شاذان (متوفی ۲۶۰ھ) سے اس کا جواب یوں نقل کیا ہے کہ یہ روایت سند کے اعتبار سے ضعیف ہے چونکہ اہل سنت کے علما نے اس کو مرسلہ نقل کیا ہے۔

لیکن شیخ طوسی نے اس جواب کو پسند نہیں کیا اور کہا یہ کہ اہل سنت کی کتب میں یہ روایت مسند اور قوی سند کے ساتھ نقل ہوئی ہے جس میں آیا ہے کہ جو کچھ میراث کے فریضہ سے بچ جائے وہ میت کے خاندان کے مردوں کو دے دیں "ماابقت الفرائض فلاولی عصبة ذکر"۔[۱]

اقول: شیخ طوسی کا فضل بن شاذان پر یہ اشکال وارد نہیں ہے چونکہ سب سے متقدم محدث عبدالرزاق صنعانی (متوفی ۲۱۱ھ) نے اس مطلب کو خود طاووس کے کلام کے طور پر نقل کیا ہے اصلا حدیث وغیرہ ہونے کی طرف اشارہ نہیں کیا۔

استاد بخاری عبدالرزاق کی عبارت یوں ہے۔ عبداللہ بن طاووس کہتا تھا میرا باپ یہ کہتا تھا: **قال اخبرنی عن ابیه ان قال :الحقوا المال بالفرائض فما ابقت۔۔۔**

اور بیہقی نے بھی اس کو بعنیہ انہیں الفاظ سے نقل کیا ہے۔

ثانیا: عبداللہ بن طاووس کی اس خبر کی خود ابن عباس اور عبداللہ کے والد طاووس نے تکذیب کی ہے اور اس کو جھوٹ قرار دیا ہے۔ (طاووس ابن عباس کے غلام تھے)۔

ابوطالب انصاری نے نقل کیا ہے کہ مجھے محمد بن احمد بربری نے، اس نے بشر بن ہارون سے، اس نے حمیدی سے، اس نے سفیان سے، اس نے ابواسحاق سے اس نے قاریہ بن مقرب سے نقل کیا ہے کہ:

میں مکہ میں ابن عباس کے پاس بیٹھا ہوا تھا میں نے ابن عباس سے کہا: اہل عراق تم سے اور تمہارے غلام طاووس سے ایک روایت نقل کرتے ہیں۔ کہ جو کچھ میراث کے فریضہ سے بچ جائے وہ میت کے باقی رشتہ دار مردوں میں تقسیم کیا جائے۔

۱۔ شیخ طوسی، تہذیب الاحکام، ۲۶۱/۹

"ما ابقت الفرائض فلاولی عصبة ذکر"

ابن عباس نے کہا: تم اہل عراق سے ہو؟

میں نے کہا: ہاں۔

اس نے کہا: وہاں جا کر سب کو بتا دینا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ: "اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا" تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے تمہیں کیا معلوم ان میں کون تمہارے لیے زیادہ مفید ہے اور ان کا حصہ فریضہ ہے۔[1]

اور اللہ تعالی نے فرمایا ہے وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ" رشتہ داروں میں بعض دوسروں سے زیادہ اولویت رکھتے ہیں"[2]

کیا یہ دونوں آیات فریضہ کو بیان نہیں کر رہی اور کچھ باقی رہ گیا ہے جس کو ان آیات نے بیان نہ کیا ہو؟

پھر کہا: اے قاری یہ نہ میں نے یہ مطلب کہا ہے اور نہ میرے غلام طاووس نے مجھ سے نقل کیا ہے بلکہ شیطان نے زبانوں پر ڈال دیا ہے۔

سفیان کہتے ہیں میرا خیال یہ ہے کہ یہ مطلب طاووس کے بیٹے عبد اللہ نے جعل کرکے اپنے باپ کی طرف نسبت دیا ہے۔ چونکہ وہ سلیمان بن عبد الملک اموی کا سکریٹری تھا (سلیمان کی مہر خلافت اس کے پاس تھی) اور عبد اللہ، بنی ہاشم کے ساتھ سخت عداوت رکھتا تھا۔

۱۔ سورہ نساء، آیہ ۱۱

۲۔ سورہ احزاب، آیت ۶

دوسری روایت

یہ روایت ترمذی نے باب البنات میں یوں نقل کی ہے کہ: عبد بن حمید نے زکریا بن عدی سے، اس نے عبداللہ بن عمرو سے، اس نے عبداللہ بن محمد بن عقیل بن ابوطالب سے، اس نے جابر بن عبداللہ انصاری سے نقل کیا ہے کہ:

سعد بن ربیع انصاری غزوہ احد میں شہید ہو گئے تو اس کی زوجہ سعد کی دونوں بیٹیوں کو لے کر رسول اللہ کی خدمت میں آئی اور عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ ان کا باپ احد میں شہید ہوگیا ہے اور ان کے چچا نے ساری میراث پر قبضہ کرلیا ہے اور ان کے پاس اگر کچھ نہ ہو تو ان کے نکاح پر کوئی رغبت نہیں کرے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان کا رب ان کا فیصلہ کرے گا۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی "**يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ**"[1]

رسول اللہ ﷺ نے ان کے چچا کو بلایا اور فرمایا بچیوں کو دو تہائی دو اور سعد کی زوجہ کو آٹھواں حصہ دو اور باقی مال تمہارا ہے۔

"ان سعد بن الربيع قتل يوم احد: فجائت امراته با بنتيه الى النبى ... واعط امها الثمن فما بقى فلك"

ا۔ سورہ نساء، آیت ۱۱

یہ روایت احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں نقل کی ہے اور ابن ماجہ اور ابو داود نے بھی اس کو باب فرائض الصلب میں محمد بن ابی عمر و عدنی سے ،اس نے سفیان بن عیینہ سے ،اس نے عبداللہ بن محمد بن عقیل بن ابی طالب سے نقل کیا ہے۔

دوسری روایت کا جواب:

اولا : تو یہ روایت ضعیف السند ہے : اگرچہ ابن حبان سبتی (متوفی ۳۵۴ھ) نے عبداللہ بن محمد بن عقیل بن ابی طالب کو سادات المسلمین اور فقہا اہل بیت میں شمار کیا ہے۔ لیکن پھر بھی اہل سنت نے اس کی روایات کو قبول نہیں کیا بلکہ اس کی روایات سے اجتناب کو واجب قرار دیا ہے کیونکہ اس کا حافظہ بہت ضعیف تھا (بوجوب مجانبة اخبارہ و رموہ بر دائة الحفظ)

اور اس کا راوی زکریا بن عدی بھی ضعیف اور مردود ہے چونکہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں اس کے بارے میں کہا ہے تو اس کا حدیث سے کیا کام وہ حدیث سے زیادہ تورات سے آگاہ تھا۔ چونکہ اس کا باپ یہودی سے مسلمان ہوا تھا۔

اور ابن ماجہ کی سند میں محمد بن یحییٰ بن ابو عمر و عدنی مکی کے بارے میں ابو حاتم نے کہا ہے کہ اس میں غفلت پائی جاتی تھی۔ میں نے اس کے پاس ایک جعلی حدیث (موضوع) پائی جس کو وہ سفیان بن عیینہ کی سند سے بیان کرتا تھا۔

پس یہ روایات جو وجوب تعصیب کے باب میں بیان کی جاتی ہے سند کے اعتبار سے قابل استدلال نہیں ہیں۔

ثانیا : ابن عباس قطعی طور پر عصبہ و خاندان کے حصے کے قائل نہیں تھے۔ ان کے بارے میں دوست دشمن سب نے لکھا ہے کہ جناب ابن عباس اور امیر المومنین تمام میراث کو طبقہ اول کو دینے کے قائل تھے۔ ہر گز طبقہ دوم اور رشتہ داروں کو دینے کے قائل نہیں تھے۔

ابن قدامہ حنبلی (متوفی ٦٢٠ھ) نے المغنی میں لکھا ہے کہ تمام صحابہ اور ان کی اتّباع میں تمام علما عول اور تعصیب کے قائل ہیں۔اور یہ بات عمر اور عباس بن عبدالمطلب ، ابن مسعود سے منقول ہے اور یہی مالک اور شافعی اور اسحاق ، دیگر اہل علم کا فتوی ہے۔ صرف ابن عباس اور ایک قلیل طایفہ اس کے مخالف ہیں جن میں محمد بن حنفیہّ ، محمد بن علی ابن الحسین (امام محمد باقر) اور عطا اور بن علی ظاہری اس بات کے قائل ہیں کہ میراث میں نہ عول جائز ہے اور نہ تعصیب" فانهم قالوا لا تعول المسائل۔

ثالثا: ان روایات کے مطابق میراث کے حصوں سے اضافی بچ جانے والا مال صرف میت کے مرد رشتہ داروں کو دیا جائے گا۔ عورتوں کو اس سے کچھ نہیں دیا جائے۔ لہٰذا اگر میت کا بھائی ہو تو اضافی حصہ اس کو ملے گا بہن کو نہیں ملے گا۔

یہ بات جاہلیت کی تقسیم کے مطابق ہے۔چونکہ جاہلیت میں عورتوں کو میراث سے حصہ نہیں دیتے تھے صرف مردوں کو دیتے تھے۔ محمد بن یعقوب کلینی (متوفی ۳۲۹ھ) نے ابو نعیم طحان کی کتاب سے نقل کیا ہے اس نے شریک سے ،اس نے اسماعیل بن ابی خالد سے ،اس نے حکیم بن جابر سے ،اس نے زید بن ثابت سے نقل کیا ہے کہ : جاہلیت میں مردوں کو میراث دیتے تھے عورتوں کو حصہ نہیں دیتے تھے۔"من قضاء الجاهلية ان يورث الرجال دون النساء "

رابعا: اگر یہ تمام ادلہ تمام نہ ہوں تب بھی اہل بیت علیہم السلام کے ماننے والوں کا اجماع ہے کہ طبقہ اول کے ہوتے ہوئے طبقہ ثانیہ کو ہر گز نہیں ملے گا۔

خامسا: اہل بیت علیہم السلام سے اس باب میں بہت ساری روایات آئی ہیں جن میں اس بات کی تصریح موجود ہے کہ میراث میں عصبہ اور خاندان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ بلکہ ہر طبقہ کے وارثوں کو ہی حصہ ملے گا۔ اگر اضافی ہو جائے تب بھی دوبارہ انہی میں تقسیم کیا جائے گا۔ صرف بیوی اور شوہر کو اضافی مال میں حصہ نہیں ملے گا۔

اس باب میں اصول کافی میں تعصیب کے بطلان کے لیے دو روایات کو نقل کیا ہے۔[۱]

جبکہ وسائل الشیعہ میں باب تعصیب میں آٹھ روایات کو نقل کیا ہے۔[۲]

ایک روایت یوں ہے امام صادق نے فرمایا: مال صرف قریبی رشتہ داروں کو ملے گا اور عصبہ کے منہ میں خاک ۔''المال للاقرب والعصبة فی فیه التراب ''

ایک اہم اشکال اور اس کا جواب

ممکن ہے کہ اہل سنت یہ کہیں کہ اگر آپ کہتے ہیں ہم نے عول و تعصیب کی وجہ سے احکام الہٰی اور فریضہ میراث کی مخالفت کی ہے تو آپ شیعہ بھی فریضہ کی مخالفت کرتے ہیں۔

مثلا: اگر میراث میں حصے دار ایک بیٹی اور والدین ہوں تو ایک اضافی حصے کو ہم لوگ دوسرے طبقے کو دیتے ہیں اور آپ لوگ پہلے طبقے کو اضافی دیتے ہیں یعنی بیٹی کو نصف کے بجائے باقی مال کے تین حصے بھی دیتے ہیں تو اس کے چھ سو میں ۳۶۰ ہو جاتے ہیں اور والدین کو باقی کا ایک ایک حصہ دیتے ہیں یعنی ان کے ۱۲۰، ۱۲۰ ہو جاتے ہیں۔

حالانکہ والدین کا حصہ ۱/۶ اور ۱/۶ تھا اور نص قرآن کے مطابق بیٹی کا حصہ نصف تھا جبکہ آپ لوگوں کے مذہب کے مطابق بیٹی کا ۵/۳، اور والدین کا ۵/۲ بن جاتا ہے۔

اگر خلیفہ ثانی نے عصبہ والوں کو دے کر حکم قرآن کی مخالفت کی ہے تو آپ نے طبقہ اول کے حصوں کو توڑ کر مخالفت کی ہے ۶/۱ کے بجائے ۵/۱ دیا ہے ۶/۳ کے بجائے ۵/۳ دیا ہے۔

۱۔ کافی، ج ۷، ۷۵

۲۔ وسائل الشیعہ ج ۲۶، باب بطلان تعصیب

جواب: طبقہ اول میں دو جہات ہیں ایک تو ان کا فریضہ ہے جو اللہ رب العزت نے معین فرمایا ہے بیٹی کا نصف ہے اور والدین کا ۱/۶ اور ۱/۶ اور دوسری جہت طبقہ اول میں یہ ہے کہ وہ اس میت کے اولوالارحام میں بھی سب سے زیادہ نزدیکی رشتے دار ہیں لہٰذا آیہ «واولوالارحام بعضھم اولی ببعض فی کتاب اللہ» (سورہ احزاب ۶) کی وجہ سے وہ باقی ماندہ حصے کے دوسرے طبقے (بہن، بھائیوں) سے زیادہ استحقاق رکھتے ہیں لہٰذا اولوالارحام ہونے کی وجہ سے باقی ماندہ ۱/۶ حصے کو پھر ان کے حصوں کے مطابق دیا جاتا ہے تو اس طرح سورہ نسا کی آیت ۱۱ اور سورہ احزاب کی آیت نمبر ۶ میں جمع ہو جاتا ہے اور دونوں آیات پر عمل ہو جاتا ہے۔

لیکن اگر بچا ہوا حصہ ۱/۶ دوسرے طبقے کو دیا جائے تو سورہ نسا کی آیت نمبر ۱۱ پر عمل ہوگا لیکن سورہ احزاب کی آیت نمبر ۶ کے مطابق اولی اور قریبی رشتے داروں کو چھوڑ کر دوسرے درجے کے رشتے دار کو دے کر مخالفت قرآن لازم آئے گی۔

اور اللہ رب العزت نے ان کے حق کی حد اکثر کو معین نہیں کیا کہ اس سے زیادہ جائز نہیں لہٰذا باقی ماندہ ان کو دے دیا جائے گا، اگر حد اکثر معین ہوتی تو اس صورت میں باقی ماندہ عصبہ اور خاندان کو دینا واجب تھا۔

اسی طرح ممکن ہے اہل سنت کہیں کہ آپ عول کے قائل ہیں چونکہ آپ لوگ بھی اگر وارثوں میں شوہر یا بیوی ہو اور ایک بیٹی ہو اور والدین ہوں تو اس صورت میں اہل سنت کہتے ہیں شوہر کا ۱/۴ اور بیٹی کا ۱/۲ اور والدین کے ۲/۶ تو چونکہ حصے زیادہ بنتے ہیں ۱/۴، ۶ بنتے ہیں اور میراث کے ۶/۶ حصے ہوتے ہیں لہٰذا خلیفہ عمر نے حکم دیا کہ سب کو کم دیا جائے تاکہ کسی حصے دار پر ظلم لازم نہ آئے اور حصے بھی میراث سے زیادہ نہ بنیں۔

شیعہ کہتے ہیں یہ عول ہے اور حرام ہے جبکہ آپ کے مسلک کے مطابق بھی عول لازم آتا ہے اس مثال میں چونکہ حصے زیادہ ہیں اور میراث کم ہے لہٰذا آپ صرف بیٹی کو کم دیتے ہیں شوہر کو چوتھا حصہ، ۶۰۰ میں ۱۵۰ اور والدین کو چھٹا چھٹا حصہ ۱۰۰ اور ۱۰۰ دیتے ہیں جو کہ ۳۵۰ بن جاتے ہیں اور باقی ۲۵۰ بیٹی کو دیتے ہیں جبکہ آیت نمبر ۱۱ سورہ نساء کے مطابق بیٹی کا حصہ نصف ہے، لہٰذا میراث میں اس کو ۳۰۰ ملنا چاہئے تھے جبکہ آپ اس کو ۲۵۰

دیتے ہیں لہذا آپ لوگ بھی عول کے قائل ہیں یعنی بیٹی کے حصے کو نصف سے کم دیتے ہیں جبکہ ہم لوگ سب کو کم دیتے ہیں جس سے کسی پر ظلم لازم نہیں آتا۔اور آپ کے مسلک کے مطابق بیٹی پر سراسر ظلم لازم آتا ہے۔

جواب: اہل بیت علیؑ، امام باقرؑ، امام صادق، ابن عباس وغیرہ نے اس اشکال کا جواب دیا ہے کہ: میراث پانے والے طبقہ اول میں بھی بعض مقدم ہیں اور بعض موخر ہیں، ان روایات کے مطابق چار قسم کے حقداروں کے حق کی مقدار کی حد اقل کو معین کر دیا ہے اس سے کم کرنا جائز نہیں حد اکثر معین نہیں کہ اس سے زیادہ دینا جائز نہیں تا کہ حتماً عصبہ خاندان والوں کو دینا پڑے گا۔

بیٹے کا چونکہ حصہ معین نہیں ہے لہذا اس کی صورت میں کوئی اشکال نہیں۔اشکال صرف بیٹی یا بہن کی صورت میں لازم آتا ہے کہ صرف ان کے حصے میں کمی کیوں کی جائے گی۔

تو اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ والدین کے حق کے حد اقل کو اللہ نے معین کر دیا ہے کہ چھٹے حصے سے کم نہیں دے سکتے اور میاں اور بیوی کے حق کا بھی حد اقل معین ہے چوتھا یا آٹھواں حصہ دیا جائے گا اور میاں بیوی اس لیے بھی مقدم ہیں کہ یہ سب طبقات کے ساتھ جمع ہو سکتے ہیں حتی کہ طبقہ اول کے ساتھ بھی پس ان چار کے حق میں ہر گز کمی نہیں کی جائے گی۔

لہذا یہ چار طائفہ مقدم ہیں باقی نقص صرف ان کے علاوہ باقی وارثوں پر ہوگا، اکثر روایات میں یہ جواب آیا ہے۔

موثقه اسحاق بن عمار عن ابی بصیر، عن ابی اعبدالله عليه السلام، ''اربعة لا یدخل علیهم ضرر فی المیراث الوالدین والزوج والزوجة''[1]

۱۔ کافی ۳، ۸۲، ۷

روایت امام باقرؑ میں یوں ہے : ''ان اللہ عزوجل ادخل الابوین علی جمیع اہل الفرائض فلم ینقصھما من السدس لکل واحد منھما وادخل الزوج والزوجة علی جمیع اہل المواریث فلم ینقصھا من الربع والثمن''[1]

پس سب وارثوں کے حصے کو کم کرنا (جسے عول کہتے ہیں) جائز نہیں ہے بلکہ صرف بیٹی اور بیٹے کے حصے میں کمی جائے گی۔ باقی چاروں کے حصے میں کمی نہیں کی جائے گی تاکہ عول لازم آئے۔

یہاں سے عول کی حرمت کی وجہ بھی روشن ہو گئی۔ چونکہ جس کے حصے کے حد اقل کو اللہ نے معین کیا تھا۔ اس سے کم دینا لازم آتا ہے جو کہ حرام ہے۔

جس طرح اگر وارثوں میں شوہر اور والدین اور بیٹی اور بیٹا ہوں قطعاً شوہر کو ۶۰۰ میں سے ۱۵۰ ملے گا ۱/۴ اور والدین کو ۲۰۰ ملے گا اور باقی ماندہ ۲۵۰ بیٹے اور بیٹی میں تقسیم ہوں گے، بیٹے کو دو برابر اور بیٹی کو ایک حصہ، تو بیٹا ساتھ ہونے کی صورت میں نصف سے کم ملے گا تو اگر صرف بیٹی ہو تو نصف کیسے ملے گا۔

ثانیا: اگر کوئی کہے چونکہ بیٹی کا نصف اللہ نے معین کیا ہے ''ان کانت واحدة فلھا النصف''[2] لہٰذا اس صورت میں اس کو کم دینا خلاف قرآن ہوگا۔ جس طرح والدین کو چھٹے حصے سے کم دینا اور شوہر کو ۱/۴ سے کم دینا خلاف قرآن ہے۔

تو اس کا جواب اولا یہ ہے کہ اگر قرآن میں آنے کی وجہ سے بیٹی کو نصف سے کم دینا جائز نہیں تو آپ اہل سنت اس کو کم کیوں دیتے ہیں (عول کی صورت میں) پس بیٹی کے حق کو کم دینے میں دونوں مذاہب کا اجماع ہے باقی رہا والدین اور شوہر یا بیوی کے حق کو کم دینے پر اس قسم کا اجماع نہیں ہے صرف خلیفہ عمر نے یہ نظریہ پیش کیا اور

۱۔ کافی، ۷، ۲، ۸۲ و ۴

۲۔ سورہ نساء، آیت ۱۱

اس کے طرفداروں نے اس کو قبول کرلیا لیکن اہل بیت کا اصرار ہے کہ نقص صرف بیٹی پر آئے گا (طبقہ اول میں) اور بہن پر آئے گا طبقہ دوم میں۔
اگر کوئی یہ کہے کہ نقص کو سب پر تقسیم کرنا عدالت ہے اور صرف بیٹی پر وارد کرنا ظلم ہے؟
جواب یہ ہے کہ اگر بیٹی کو کم دینا ظلم ہے تو اصل میراث سے بیٹی کو نصف اور بیٹے کو دو برابر دینا بھی ظلم ہوگا چونکہ آج کا دیموکرٹیک مسلمان اس کو بے انصافی سمجھتا ہے تو کیا "فلذکر مثل حظ الانثیین" سورہ نساء کی آیت نمبر ۱۱ کو حذف کر دیا جائے۔

نتیجہ

بحمد اللہ اس مقالے میں عول و تعصیب کے حوالے سے طرفین کی ادلہ کو نہایت متانت سے بیان کیا گیا ہے اور اس کی علمی اور تاریخی، اور عرفی قواعد کے مطابق تحقیق کی گئی ہے کہ دوسرے خلیفہ کے زمانے میں میراث کے باب میں عول و تعصیب کے بارے میں کیا جانے والا فیصلہ قرآن و سنت کی رو سے باطل ہے۔
اور مسئلہ کا مختصر تاریخچہ اور موافقین اور مخالفین کے ذکر کے ساتھ ساتھ ان کی ادلہ کو افراط و تفریط سے دور رہ کر مطالعہ کیا گیا ہے اور اس تحقیق سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ نظریہ عول و تعصیب قطعی طور پر باطل اور مخالف قرآن و سنت ہے اور جاہلیت کے مسائل سے شباہت رکھتا ہے۔

مصادر

۱. ۔سورہ نساء، آیت ۱۱

۲. ۔سورہ نساء، آیت ۱۷۶

۳. ۔سورہ سجدہ، آیت ۵

۴. ۔سورہ سجدہ، آیت ۶

۵. ۔شیخ طوسی :التھذیب، ج۹، ص ۲۵۴،۲۵۱

۶. ۔اصول کافی ۷/ ۷۸-۸۲

۷. ۔کافی ۷/ ۷۵

۸. ۔کافی ۷/ ۷۲-۷۵

۹. ۔شیخ طوسی محمد بن حسن التھذیب ج ۹/ ۲۴۷–۲۶۸تک

۱۰. ۔بحار الانوار، ج ۱۰۱/ ۳۲۸–۳۳۸

۱۱. ۔الحاوی الکبیر ماوردی بغدادی ۱۶، ۱۲۹

۱۲. ۔سورہ احزاب، آیت ۶

۱۳. ۔شیخ طوسی، تہذیب الاحکام، ۲۶۱/۹

۱۴. ۔سورہ نساء، آیہ ۱۱

۱۵. ۔سورہ احزاب، آیت ۶

۱۶. ۔سورہ نساء، آیت ۱۱

۱۷. ۔کافی، ج۷، ۷۵

۱۸. ۔وسائل الشیعہ ج،۲٦ باب بطلان تعصیب

۱۹. ۔کافی ۳، ۸۲، ۷

۲۰. ۔کافی ،۷، ۲، ۸۲و۴

۲۱. ۔سورہ نساء، آیت ۱۱

سیدہ نصرت امین اور آیت اللہ جوادی آملی کی نظر میں سحر (جادو) کا مفہوم، ماہیت، اور اُسکی اقسام

سید محمد ریحان الرضا نقوی[1]

استاد ڈاکٹر سید محمد علی عون[2]

خلاصہ

جادو کا رواج طول تاریخ کے مختلف معاشروں میں رہا ہے، عصر حاضر میں بھی مسلمان ممالک سمیت کئی ممالک میں جادو وغیرہ موجود ہے۔ اس اعتبار سے جادو ایک اہم موضوع ہے جس کے بارے میں اسلامی نقطہ نگاہ سے تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس تحقیق میں دو شیعہ مفسرین، تفسیر مخزن العرفان در علوم قرآن کی مصنفہ سیدہ نصرت امین اور تفسیر تسنیم کے مصنف آیت اللہ جوادی آملی کے نزدیک جادو کے مفہوم، حقیقت، اور اُسکی اقسام کے بارے میں نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ سیدہ نصرت امین کا نظریہ ہے کہ جادو وہ عمل ہوتا ہے جس کا سبب مخفی ہو اور وہ فریب کے ہمراہ ہو نیز اسکی بنیاد جادو گر کے نفس کی طاقت اور اس کا شر ہوتا ہے۔ آیت اللہ جوادی آملی کے مطابق جادو شیاطین سے دوستی اور انکی معاونت حاصل کرنے اور دوسروں کو ضرر پہنچانے کے لئے انجام دیا جاتا ہے نیز تمام خارق العادہ امور کی مانند یہ بھی ارادے اور روح کی قوت کی بنا پر وجود میں آتا ہے۔ دونوں مفسروں کے نزدیک جادو علوم غریبہ میں سے ایک علم ہے جو سیکھا اور سکھایا جا سکتا ہے۔ نیز یہ ایک باطل عمل ہے لیکن حقیقت رکھتا ہے اور اسکے اثرات ہوا کرتے ہیں۔ دونوں مفسروں نے جادو کی کئی اقسام کو بھی بیان کیا ہے جن کو اس مقالے میں ذکر کیا گیا ہے۔ آخر میں دونوں مفسرین کے نقطہ نظر کے درمیان نکات اشتراک و افتراق کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

---

[1] ایم۔ فل تفسیر و علوم قرآن، المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

[2] فیکلٹی ممبر، جامعہ المصطفیٰ ص العالمیہ

بنیادی کلمات : سحر، جادو، تفسیر، تفسیر موضوعی، تفسیر مخزن العرفان، تفسیر تسنیم، آیت اللہ جوادی آملی، سیدہ نصرت امین

مقدمہ

جادو ایک ایسا موضوع ہے جو کئی مسلمان محققین و مفسرین اور مستشرقین کی دلچسپی کا باعث رہا ہے۔ مستشرقین میں ایک طویل عرصے تک یہ فکر غالب رہی ہے کہ دین کی جڑیں جادو میں پیوستہ ہیں۔ مثال کے طور پر جیمز فریزر کے مطابق ادیان جادو کے بعد وجود میں آئے ہیں۔[1] جیمز فریزر ہی کے نظریے کے مطابق تمام خارق العادہ امور کو بنیادی طور پر دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: جادو اور دین۔[2] البتہ جادو عموما مختلف ادیان میں مذموم ہے۔ دین اسلام میں، تمام فقہائے اسلام کے فتاویٰ کے مطابق جادو سیکھنا، اعمال جادو کو انجام دینا اور جادو گری حرام ہے۔ لیکن اسکے باوجود کئی مسلمان معاشروں اور کمیونٹیز میں ایسے لوگ کثرت سے پائے جاتے ہیں جو جادو کرتے یا کرواتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوستان اور پاکستان کے مختلف علاقوں میں جادو ایک عام سی شے گردانا جاتا ہے اور کئی لوگ حسد کے تحت رشتے داروں یا دشمنوں کو نقصان پہنچانے کے لئے جادو گروں کے پاس جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس بات کے شواہد بھی پائے جاتے ہیں کہ یورپ میں مقیم بعض مسلمان حلقوں میں جادو کرنے اور کروانے کا رواج پایا جاتا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق ڈنمارک میں رہائش پذیر پاکستانی کمیونٹی کے کچھ لوگ کالے جادو پر عمل کرتے یا کرواتے ہیں۔[3] اس تناظر میں یہ تحقیق انجام دی جائے گی جس کا مقصد جادو کی تعریف اور اسکی اقسام سے آشنائی حاصل کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے دو شیعہ مفسرین کے جادو

---

[1] J. Frazer in F.B. Jevons, Magic and Religion, ۱۹۱۷, Folklore, vol. ۲۸, no. ۳۰, p. ۲۵۹-۲۷۸.

[2] J. Frazer, in M. Titiev, A fresh approach to the problem of magic and religion, ۱۹۶۰, Southwestern Journal of Anthropology, vol. ۱۶, no. ۳, ۲۹۲-۲۹۸.

[3] M. Rytter, In-Laws and Outlaws: Black Magic among Pakistani Migrants in Denmark, ۲۰۱۰, The Journal of the Royal Anthropological Institute, vol. ۱۶, no. ۱, p. ۴۶-۶۳.

کے بارے میں تفسیری نظریات کا مطالعہ کیا جائے گا: سیدہ نصرت بیگم امین جو کہ تفسیر مخزن العرفان در علوم قرآن کی مصنفہ ہیں اور آیت اللہ عبداللہ جوادی آملی جو کہ تفسیر تسنیم کے مصنف ہیں۔

قرآن کریم میں جادو

قرآن کریم میں جادو کے لئے سحر کا لفظ آیا ہے۔ سحر اور اس کے مشتقات قرآن کریم کی اکسٹھ آیات میں پائے جاتے ہیں۔ مجموعی طور پر ان آیات کو پانچ گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جس میں کافرین کی جانب سے انبیاء ع پر جادوگر ہونے کی تہمت لگائے جانے کا ذکر ہے۔ آیات کا دوسرا گروہ وہ ہے جس میں کفار مکہ کا معاد کے ذکر کو سحر سے تعبیر کرنا اور آخرت کی آگ کو بطور طنز سحر کہا جانا جیسے مطالب شامل ہیں۔ آیات کا تیسرا گروہ وہ ہے جس میں حضرت موسیٰ ع کے فرعونی جادوگروں سے مقابلے کو بیان کیا گیا ہے نیز موسیٰ ع کو فرعونیوں کی جانب سے ساحر کہہ کر پکارنے اور ان سے عذاب الٰہی کو ٹالنے کی استدعا کا ذکر ہے۔ چوتھا گروہ وہ ہے جس میں قوم سلیمان ع کے جادو کے ذریعے امتحان کا ذکر ہے جبکہ پانچواں گروہ سورۃ الفلق کی آیات پر مشتمل ہے۔ پس قرآن کریم کی آیات کی ایک قابل ذکر تعداد جادو سے مربوط ہے۔ اس تحقیق کا مقصد جادو کے مفہوم، ماہیت، اور اسکی اقسام کو جاننا ہے جس کے حصول کے لئے فسیر مخزن العرفان در علوم قرآن کی مولفہ سیدہ نصرت امین اور تفسیر تسنیم کے مولف آیت اللہ جوادی آملی کے جادو کے بارے میں نظریات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

سیدہ نصرت امین کی نگاہ میں جادو (سحر) کا مفہوم اور ماہیت

سیدہ نصرت امین تفسیر مخزن العرفان میں سحر کی تعریف بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتی ہیں کہ لغت میں سحر اس چیز سے عبارت ہے کہ جس کا سبب مخفی اور نا معلوم ہو اور سحر، فتحہ کے ساتھ، غذا کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ شکم میں مخفی ہوتی ہے اور اسکا عمل بھی ظاہر نہیں ہو رہا ہوتا۔[۱]

جوھری نے الصحاح اور فیروزآبادی نے القاموس المحیط میں سحر کے اسی معنی کو مراد لیا ہے۔ یعنی کلُّ مالَطُفَ مَأخَذُہُ ودَقَّ فہو سِحرٌ۔[۲] اگرچہ بانو امین نے اس منبع کو اپنی تفسیر میں ذکر نہیں کیا لیکن بدیہی ہے کہ انکی نظر میں سحر کا یہی معنی قرین قیاس ہے۔ البتہ سحر کا یہ معنی سحر کے علاوہ کئی دیگر افعال پر بھی صادق آتا ہے جن کا سب بظاہر مخفی ہو جیسے معجزہ، کرامت، استجابت دعا، چشم زخم، طلسم، کہانت، شعبدہ وغیرہ۔ یہاں تک کہ یہ معنی ان جدید ایجادات پر بھی صادق آتا ہے کہ جن کی حقیقت اور واقعیت اور انکا سبب عوام الناس کے لئے قابل درک نہیں ہے۔

جادو کی مندرجہ بالا تعریف کے علاوہ سیدہ بانو امین سورۃ الفرقان کی آیت ۸ (وَ قالَ الظَّالِمُونَ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَسْحُوراً) کے ذیل میں فرماتی ہیں: کہتے ہیں کہ سِحر، سَحر سے مأخوذ ہے اور اس کا مطلب روشنی اور تاریکی کا ایک دوسرے سے اس طرح مخلوط ہو جانا ہے کہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں اور جادو یعنی دو روئی کا پایا جانا یعنی ایک طرف حق کی سمت اور ایک طرف باطل کی سمت یعنی جادو گر حق اور سچائی کو باطل میں ملا دیتا ہے۔[۳]

سیدہ نصرت امین جادو کے اصطلاحی معنی کے بارے میں فرماتی ہیں: شریعت کے عرف میں ایسا عمل (یعنی جادو) مذموم ہے کہ جس کا سبب مخفی ہو اور وہ خدعہ اور فریب دینے کے لئے کیا جاتا ہو اور انسان کے تخیل میں وہ چیز

---

۱ مخزن العرفان در تفسیر قرآن، ج ۲، ص ۵.

۲ الصحاح، ج ۲، ص ۶۷۹/القاموس المحیط، ج ۲، ص. ۴۵

۳ مخزن العرفان در تفسیر قرآن، ج ۹، ص. ۱۶۷

پیش کرتا ہو جو حقیقت کے خلاف ہو جیسا کہ جادو کے بارے میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے: «یُخَیَّلُ إِلَیهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّها تَسْعی»۔[1]

پس سیدہ نصرت امین نے جادو کے اصطلاحی معنی کے بیان کرنے میں بھی سحر کے لغوی معنی سے استفادہ کیا ہے یعنی ہر وہ عمل کہ جس کا سبب مخفی اور نامعلوم ہو اور ساتھ میں یہ اضافہ کیا ہے کہ وہ عمل خدعہ اور تدلیس یعنی فریب کاری کے ہمراہ انجام دیا گیا ہو۔

سیدہ نصرت امین جادو اور انسانی ادراک کے مابین رابطے کے بارے میں تحریر کرتی ہیں کہ سحر کی اقسام میں سے ایک بلکہ اسکی عمدہ اقسام میں سے ایک قوت خیال میں تصرف کرنا ہے کہ جادوگر اپنے عمل کے ذریعے کسی شخص یا اشخاص کی قوت واہمہ اور خیال میں تصرف کرے اور خاص اعمال کے ذریعے اسکی قوت تخیل پر غالب آ جائے اور اُن کو اپنے زیر اثر لے آئے۔ مثلاً کسی کو یہ باور کروادے کہ تم مریض ہو جبکہ وہ مریض نہ ہو اور اس کے نتیجے میں وہ شخص واقعی بیمار ہو جائے۔ نیز سیدہ نصرت امین کے مطبق جادو کی اقسام میں سے ایک کسی بُرے شخص کے نفس کی تائثیر ہے کہ وہ اس کے ذریعے کسی مواد پر اثر انداز ہو سکتا ہے اور اسکے ذریعے مختلف قسم کی افسونگری کر سکتا ہے یعنی لوگوں کو مسحور کر کے فریب دے سکتا ہے۔ جس طرح کہ بری نظر تاثیر رکھتی ہے اسی طرح جادوگر کا نفس جو کہ خاص قسم کے اعمال انجام دینے کی ہمت رکھتا ہے وہ بھی تائثیر رکھتا ہے۔ بالکل اسی طرح کہ جس طرح اچھے آدمیوں کا نفس اچھا نفوذ رکھتا ہے، برے آدمیوں کا نفس برا نفوذ رکھتا ہے اور انکے نفوس سے نکلنے والا زہر سانپ کے زہر سے زیادہ ضرر رسان ہوا کرتا ہے۔[2] سیدہ نصرت امین مزید فرماتی ہیں کہ سحر ایک قسم کی تدلیس اور مکر ہے کہ جادوگر کی شیطانی طاقتوں کی وجہ سے ظاہر ہوتا ہے اور اس کا غلبہ اور تصرف

---

۱ سورۃ طہ، آیت ۶۹/ مخزن العرفان در تفسیر قرآن، ج ۲، ص ۴ (. در عرف شرع چنین عملی راکہ سببش مخفی واز روی خدعہ وتدلیس صورت گیرد ودر خیال انسان ارائہ دہد آنچہ راکہ برخلاف واقع است مذمت نمودہ چنانچہ در بیان مذہب سحر فرمودہ یُخَیَّلُ إِلَیهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّها تَسْعی).

۲ مخزن العرفان در تفسیر قرآن، ج ۱۵، ص. ۳۶۵

قوت خیال و واہمہ پر ہوا کرتا ہے اور جادو اُن انسانوں پر اثر انداز ہوتا ہے کہ جنکی عقول کمزور ہیں اور اقوائے بشر یعنی عقلی طور پر مضبوط انسانوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔[1] اس تعریف کی بنا پر سیدہ نصرت امین اس بات کی قائل ہیں کہ نفوس عالیہ یعنی معصومین ع بالخصوص رسول اللہ ص پر جادو کا اثر کرنا ہونا محال ہے۔[2]

آیت اللہ جوادی آملی کی نگاہ میں جادو (سحر) کا مفہوم اور ماہیت

آیت اللہ جوادی آملی نے تفسیر تسنیم کی پانچویں جلد میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۰۲ کے ذیل میں سحر کے لغوی معنی کو بیان کیا ہے۔[3]

سب سے پہلے وہ راغب اصفہانی کی نظر میں سحر کے لغوی مفہوم کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ راغب اصفہانی نے اس لفظ (یعنی سحر) کے تین معانی ذکر کئے ہیں۔

سحر کا ایک معنی نیرنگ (دھوکہ) اور خیال پردازی ہے کہ جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کی مثال شعبدہ بازی ہے جو کہ نظر بندی کے ذریعے انجام دی جاتی ہے اور اس کی جانب مندرجہ ذیل آیت میں اشارہ ہوا ہے:

سحر وااء عین الناس واسترہبوہم)۔[4]

---

۱ مخزن العرفان در تفسیر قرآن، ج۱۵، ص. ۳۶۵

۲ مخزن العرفان در تفسیر قرآن، ج۱۵، ص: . ۳۶۵

۳ واتبعوا ما تتلوا الشّیاطین علی ملک سلیا من وما کفر سلیمان ولکنّ الشّیاطین کفروا یعلّمون النّاس السّحر وما انزل علی الملکین ببابل ہاروت وماروت وما یعلّمان من احد حتّی یقول انّما نحن فتنۃٌ فلا تکفر فیتعلّمون منہما ما یفرّقون بہ بین المرء وزوجہ وما ہم بضآرّین بہ احدٍ الا باذن اللّہ ویتعلّمون ما یضرّہم ولا ینفعہم ولقد علموا لمن اشتراہ مالہٗ فی الآخرۃ من خلاقٍ ولبئس ما شروا بہ انفسہم لو کانوا یعلمون

۴ سورۃ الاعراف، آیت ۱۱۶.

سحر کا دوسرا معنی شیاطینِ جن کی معاونت اور دوستی حاصل کرنے کے لئے ایسے افعال کو انجام دینا کہ جو شیاطین سے تقرب کا باعث بنتے ہیں اور اس کی جانب مندرجہ ذیل آیات میں اشارہ ہوا ہے: ہل اء نبّئکم علی من تنزّل الشیاطین * تنزّل علی کلّ اء فاّکٍ اء ثیم[١]،اور و لکن الشیاطین کفروا یعلّمون الناس السحر۔[٢]

سحر کا تیسرا معنی اشیاء کی صورت اور طبیعت کو بدل دینا ہے۔ مثلاً انسان کو حیوان کی صورت میں تبدیل کر دینا کہ جسکی کوئی حقیقت نہیں ہے۔[٣]

اسکے بعد آیت اللہ جوادی آملی نے ابن فارس کی نظر میں سحر کے لغوی معانی کا ذکر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ابن فارس نے بھی سحر کے تین متباین معانی کا ذکر کیا ہے: سحر، سین فتحہ اور حاء سکون کے ساتھ جو کہ جسم کے اعضاء میں سے ایک عضو (پھیپھڑے) کا معنی دیتا ہے، سحر، سین اور حاء دونوں فتحہ کے ساتھ جو کہ اوقات میں سے ایک وقت یعنی نزدیک صبح کا معنی دیتا ہے، اور سین کسرہ اور حاء سکون کے ساتھ جو کہ دھوکہ اور حق کو باطل کی صورت میں پیش کرنے کے معانی دیتا ہے۔[٤]

آیت اللہ جوادی آملی فرماتے ہیں کہ ابن فارس سحر کے مادہ کے لئے ایک اصل کے قائل ہیں اور وہ یہ ہے کہ آنکھ یا دل کو حقیقت اور واقعیت سے باطل کی جانب اور اس شے کی جانب منصرف کر دینا کہ جو کوئی حقیقت اور واقعیت نہیں رکھتی۔ اسلئے ان کی نظر میں اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی آں کھ کو اس شے سے کہ جس کا اس نے ظاہر میں مشاہدہ کیا ہو یا اس کے دل کو اس شے سے کہ جس کا اس نے باطن میں مشاہدہ کیا ہو منصرف کر دے (اور اسکے برخلاف دکھلائے) تو کہا جاتا ہے کہ اس نے جادو کیا ہے اور وہ جادوگر ہے۔ آیت اللہ جوادی آملی مزید

---

١ سورۃ الشعرا، آیات ٢٢١-٢٢٢.

٢ سورۃ البقرۃ، آیت ١٠٢.

٣ مفردات راغب، س ح ر (تفسیر تسنیم میں).

٤ مقاییس اللغۃ، ج ٣، ص ١٣٨، س ح ر (تفسیر تسنیم میں).

فرماتے ہیں کہ ابن فارس نے سحر کے مندرجہ بالا ذکر کے بعد دیگر دو معانی (اوقات میں سے ایک وقت اور اعضاء میں سے ایک عضو) کا بھی تکلفاً ذکر کیا ہے لیکن ان کو بھی اسی مندرجہ بالا معنی کی جانب پلٹا دیا ہے۔[1]

آیت اللہ جوادی آملی کی نظر میں سِحر اور سَحَر اس اعتبار سے ہم آہنگ ہیں کہ نزدیک صبح یعنی سَحَر کے وقت نور اور ظلمت باہم اس طرح مخلوط ہوتے ہیں کہ نہ تو پوری روشنی ہوتی ہے اور نہ ہی مکمل اندھیرا، اور سِحر اس بات کا معنی دیتا ہے کہ حق اور باطل اس طرح مخلوط ہوتے ہیں کہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ حق ہے یا باطل۔ اس بناپر آیت اللہ جوادی آملی کے مطابق راغب نے جادو کے معانی کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کی بناپر سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۰۲ میں سحر خیال پردازی اور شعبدہ نہیں ہے بلکہ واقعیت رکھتا ہے کہ اس کے انجام کے ذریعے شیاطینِ جن کی معاونت اور دوستی حاصل ہوتی ہے۔

پس یہ کہا جاسکتا ہے کہ آیت اللہ جوادی آملی کی نگاہ میں جادو کی مندرجہ ذیل تعریف ہے: جادو خارق العادہ علوم میں سے ایک قابل انتقال اور قابل تعلیم ہے جو کہ غیر محسوس اور غیر مادی علل اور مبادی رکھتا ہے اور اسکا ہدف شیاطین کی دوستی اور معاونت حاصل کرنے کے لئے دھوکہ دہی کے ذریعے دوسروں کو نقصان پہنچانا ہے۔

آیت اللہ جوادی آملی نے اپنی تفسیر میں سحر کے اصطلاحی معنی کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا۔ البتہ اگر جادو کے بارے میں ان کے تفسیری نظریات کا جائزہ لیا جائے تو ممکن ہے کہ ان سے جادو کے اصطلاحی معانی کا استخراج یا ان کو اخذ کیا جاسکے۔

آیت اللہ جوادی آملی نے تفسیر تسنیم میں خارق العادہ امور کی چند اقسام بیان کی ہیں۔ اس سلسلے میں وہ فرماتے ہیں: خارق عادت اور غیر عادی اعمال کی چند اقسام ہیں۔ ایک قسم کی علت مادی اور محسوس ہوا کرتی ہے اگرچہ وہ خود غیر محسوس ہوا کرتا ہے جیسا کہ زہر کھانے کے باوجود نہ مرنا کہ اگرچہ ایک خارق عادت عمل ہے لیکن اس کی

[1] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم، ج ۵، ص ۷۳، س ح ر (تفسیر تسنیم میں).

وجہ تکرار اور مشق ہے (تکرار کہ جس کی وجہ سے بدن میں زہر کے مقابلے میں مقاومت پیدا ہو جاتی ہے) اور وہ ایک عادی اور طبیعی امر ہے۔[1]

اسکے بعد آیت اللہ جوادی آملی خارق العادہ امور کی دوسری قسم کا بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اسکی علت مادی اور طبیعی ہوتی ہے لیکن سرعت عمل کی کی وجہ سے محسوس نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں وہ ایک مثال پیش کرتے ہیں کہ جیسے کوئی کسی رسی کو اتنی تیزی سے گھمائے کہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے یا کسی چزا کو انتہائی تیزی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کردے۔ وہ مزید فرماتے ہیں کہ اسے شعبدہ کہا جاتا ہے۔

آیت اللہ جوادی آملی کے مطابق خارق العادہ امور کی تیسری قسم وہ ہے کہ جس کی علل غیر مادی اور غیر محسوس ہوا کرتی ہیں جیسا کہ پیش گوئی اور آئندہ کی خبریں دینا جو کہ مرتاض اور کاہن وغیرہ دیا کرتے ہیں کہ کبھی تو درست ثابت ہوتی ہں اور کبھی نادرست۔ مفسر محترم اس کے بعد فرماتے ہیں کہ جادو کا موضوع اسی تیسری قسم سے ہے اور بحث یہ ہے کہ جبکہ ہر عمل چاہے محسوس ہو یا غیر محسوس، عادی ہو یا غیر عادی، بغیر علت کے نہیں ہوا کرتا تو پھر اس قسم کے خارق العادہ امور (یعنی جادو) کیسے وجود میں آتے ہیں۔[2]

آیت اللہ جوادی آملی کے مطابق اس قسم کے اعمال، چاہے ان پر جادو کا اطلاق ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو، قدرت ارادہ اور قدرت روح کی بناپر وجود میں آتے ہیں چونکہ اگرچہ انسان روح اور بدن کا مرکب ہے اسکی اصل روح ہے اور

---

۱ تفسیر تسنیم، ج ۵، ص ۴۹۸۔

(اعمال خارق عادت و غیر عادی. بر چند قسم است : قسمی از آن علّت مادی و محسوس و عادی دارد؛ گرچہ خودش غیر محسوس است ؛ نظیر سم خوردن و نمردن کہ گرچہ کاری خارق عادت است، ولی منشاء آن کہ کثرار و تمرین متمادی در این کار است (تکراری کہ سبب می شود بدن در برابر سم مقاومت پیدا کند) امری عادی و طبیعی است.)

۲ تفسیر تسنیم، ج ۵، ص ۴۹۸.

بدن فرع۔ یہاں آیت اللہ جوادی آملی امام جعفر الصادق (ع) سے منسوب ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہے: اصل الانسان لبّہ۔[1]

سیدہ نصرت امین کی نظر میں جادو کی اقسام

سیدہ نصرت امین کے مطابق سحر کی بہت سی اقسام اور ان گنت شاخیں ہیں۔ وہ تفسیر مخزن العرفان میں تحریر فرماتی ہیں کہ سحر دروغ (جھوٹ) نہیں ہے اور اسکے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا بلکہ بحث جادو کی قسم اور اسکی تاثیر کے بارے میں ہے۔ نیز اس میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے کہ جادو کا عمل دنیا میں مختلف انواع و اقسام کی صورت میں انجام دیا جاتا ہے اور اسکے وقوع سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔[2] اس کے بعد وہ جادو کی چار اقسام کا ذکر کرتی ہیں۔

سیدہ نصرت امین کے مطابق جادو کی پہلی قسم طبیعی علوم سے متعلق ہے۔ اس قسم کے جادو کے سبب کا علم عام لوگوں کو نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر کوئی شخص (یعنی جادو گر) ایک خاص قسم کا مواد کہ جس پر آگ اثر انداز نہ ہوتی ہو اپنے جسم کے اعضاء پر مل لے اور اسکے بعد آگ میں داخل ہو جائے اور نہ جلے۔ یا پھر کوئی ایسی تحریر لکھے جو صرف وہ پڑھ سکتا ہو وغیرہ۔

سیدہ نصرت امین کے مطابق جادو کی دوسری قسم وہ ہے کہ جو کسی عمل کو کثرت سے بجالانے یا اسکی تمرین و تکرار کرنے کی بنا پر اس کا عادی ہو جانے کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر کوئی زہر کھانے کا عادی ہو جائے اور اس لئے زہر کی ایک خاص مقدار کھا کر نہ مرے۔

جادو کی اس قسم کے بارے میں سیدہ نصرت امین تحریر فرماتی ہیں چونکہ اس قسم کے جادو کی علت اور سبب معلوم اور روشن ہے اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ جادو کی یہ قسم ادلہ شرعیہ کی بنا پر حرام کے زمرے میں نہیں آتی۔ اس

---

۱ بحارالانوار، ج ۱، ص ۸۲ (تفسیر تسنیم میں).

۲ مخزن العرفان در تفسیر قرآن، ج ۲، ص ۵.

سلسلے میں وہ مزید تحریر فرماتی ہیں کہ جادو کی اس قسم کی ممانعت ظاہراً شرعی اعتبار سے نہیں ہوئی بلکہ شاید جادو کی یہ قسم سحر کی اقسام میں ہی شمار نہ ہوتی ہو کیونکہ اس کا سبب معلوم ہے۔[1]

سیدہ نصرت امین کے مطابق جادو کی تیسری قسم شعبدہ ہے اور شعبدہ کا سبب دو چیزیں ہوا کرتی ہیں۔ ایک تو سرعت عمل کہ جس کا سبب شعبدہ باز کی انتہائی تیز حرکات ہوا کرتی ہیں اور دوسرا دیکھنے کی حس میں خطا کہ جو بہت زیادہ واقع ہوا کرتی ہے۔ شعبدہ باز حاضرین کے لئے ایک چیز پیش کرتا ہے اور پھر فوراً اسکو کسی اور شکل میں تبدیل کر دیتا ہے جبکہ حس بصر پہلی چیز کی شکل میں مشغول تھی جبکہ دوسری اس سے بالکل مختلف ہے۔ جادو کی یہ قسم خیال میں تصرف کی انواع میں سے ایک ہے کہ حاضرین کے ذہن اور ان کے خیال میں خلاف واقع چیز کو پیش کرتا ہے اور یہ سرعت عمل نیز دیکھنے اور سننے کی قوتوں میں وقتی طور پر خلل پیدا ہو جانے کی وجہ سے ہوتا ہے اور کسی صورت میں بھی واقعیت نہیں رکھتا۔

سیدہ نصرت امین کی نظر میں جادو کی چوتھی قسم وہ ہے جو کہ قوت نفس اور عزم و ارادے کی قوت کی بنا پر انجام دی جاتی ہے اور اسے "علم لیمیا" کہا جاتا ہے۔ اس جادو کی صلاحیت اس صورت میں حاصل ہوتی ہے جب کوئی اس بات سے آگاہ ہو جائے کہ عام انسانی نفوس کا نفوس عالیہ اور قوی ارواح سے ارتباط اور تعلق کیسے استوار کیا جاتا ہے اور ان کی قوتوں سے اتصال کس طرح برقرار کیا جا سکتا ہے (تاکہ ان کو بروئے کار لایا جا سکے)۔[2]

مندرجہ بالا بحث کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیدہ نصرت امین نے جادو کی جو چار اقسام بیان کی ہیں ان میں سے پہلی دو جادو کی حقیقت سے خارج ہیں اور ان کو جادو نہیں شمار کیا جا سکتا کیونکہ ان کا سبب معلوم ہے جبکہ آخری دو اقسام کو سیدہ نصرت امین نے صراحت کے ساتھ جادو شمار کیا ہے اور ان کی تاثیر کو ناقابل انکار قرار دیا۔

---

۱ مخزن العرفان در تفسیر قرآن، ج ۲، ص ۵.

۲ مخزن العرفان در تفسیر قرآن، ج ۲، ص ۵.

مندرجہ بالا تقسیم جادو کے علم ہونے کے اعتبار سے نہیں ہے۔ جہاں تک جادو کے ایک علم ہونے کا تعلق ہے تو اس اعتبار سے سیدہ نصرت امین نے تفسیر مخزن العرفان میں مندرجہ ذیل سات قسم کے علوم کا ذکر کیا ہے جن میں سے کئی کا ذکر شیخ بہائی نے اپنی کتاب "کلّہ سرّ" میں شامل کیا ہے اور ان علوم کی وضاحت علامہ طباطبائی نے بھی تفسیر المیزان میں بیان کی ہے۔[1]

علم شیمیا: یہ وہ علم ہے جو طبیعی امور میں تصرف کرنے کے لئے ارادی قوتوں کے کچھ خاص مادی قوتوں سے ملاپ کی کیفیت کے بارے میں بحث کرتا ہے۔ اسی علم کا نتیجہ خیال میں تصرف ہے کہ جس کو سحر عیون بھی کہا جاتا ہے اور یہ جادو کی صحیح ترین اقسام میں سے ایک شمار ہوتا ہے۔

علم لیمیا: یہ وہ علم ہے جو تاثیر ارادی کی کیفیت کے بارے میں بحث کرتا ہے نیز اس سے بحث کرتا ہے کہ ان قوی اور عالی ارواح سے جو کہ کواکب یا حوادث پر موکل ہیں سے کیسے اتصال کیا جاسکتا ہے اور ان کو کیسے مسخر کیا جاسکتا ہے۔ جنوں کی تسخیر اور ان سے مدد طلب کرنا بھی اسی علم کی ابحاث مین شامل ہے۔ اس علم کو "فن تسخیرات" بھی کہا جاتا ہے۔

علم ہیمیا: یہ وہ علم ہے جو دنیا کی قوای علوی (اونچی یا اعلیٰ قوتوں) کی سلفی عناصر کے ساتھ ترکیب اور اس کے نتیجے میں عجیب امور کے وجود میں آنے کے بارے میں بحث کرتا ہے اور اسے "علم طلسمات" بھی کہتے ہیں۔ سیدہ نصرت امین آگے تحریر کرتی ہیں کہ موجودات علوی اور آسمانی (یعنی وہ موجودات جو اونچے یا بالا مقامات وجود میں پائے جاتے ہیں) مادی حوادث اور واقعات کے ساتھ اسی طرح ارتباط رکھتے ہیں جس طرح مادی عناصر کی ترکیب اور ان کے امتزاج سے طبیعی امور حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے جب بھی سماوی اشکال (اس سے مفسر کی مراد وہی آسمانی موجودات ہے) اسطرح سے ترکیب کریں یعنی آپس میں امتزاج کریں جو حوادث میں سے کسی

---

۱ طباطبایی، المیزان، ج ۱، ص. ۲۴۶

ایک مادی حادثے کے مناسب ہو مثلاً فلاں کی موت یا فلاں کو بقا حاصل ہو تو اس کا نتیجہ وہی ہوتا ہے (یعنی کسی کو موت حاصل ہو جاتی ہے یا کوئی بچ جاتا ہے)۔ اور یہ ہے طلسم کا مطلب۔ البتہ یہاں مفسرہ نے مزید وضاحت نہیں کی کہ سماوی موجودات یا اشکال سے یہاں کیا مراد ہے اور انکی ترکیب یا آپس میں امتزاج کا کیا معنی ہے نیز انکی آپس میں ترکیب کا تعلق مادی حوادث سے کس بنا پر برقرار ہوتا ہے۔

علم دیمیا: یہ وہ علم ہے جو کہ اس بات کے بارے میں بحث کرتا ہے کہ مادی قوتوں سے کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ وہ دیکھنے والوں کی حسوں (یعنی دیکھنے اور سننے کی قوت وغیرہ) پر خارق العادہ آثار مترتب ہوں۔ سحر کی اس قسم کو "شعبدہ" کہتے ہیں۔

علم کیمیا: سیدہ نصرت امین کی تعریف کے مطابق یہ علم مندرجہ بالا چار علوم (سحر کی اقسام) یعنی شیمیا، لیمیا، ھیمیا، اور دیمیا کی ترکیب سے وجود میں آتا ہے اور یہ علم ایک دھات کو دوسری دھات میں تبدیل کر دینے کا علم ہے۔

سیدہ نصرت امین نے اسکے بعد ایک اور علم کا ذکر کیا ہے کہ جسے وہ مندرجہ بالا پانچ علوم سے ملحق گردانتی ہیں۔ اس علم کو "علم اعداد و اوقاف" کہتے ہیں جو کہ اعداد اور حروف کے ارتباطات کے بارے میں بحث کرتا ہے کہ جن کی وجہ سے مطلوبہ مقصد کو حاصل کیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے حروف اور اعداد کو مثلث یا مربع جدول میں ایک خاص وضع اور طریقے سے لکھا جاتا ہے۔

نیز مفسرہ نے "مقناطیسی نیند اور احضار ارواح" کو بھی علم سحر کے ملحقات میں سے ایک قرار دیا ہے۔[1]

---

۱ مخزن العرفان در تفسیر قرآن، ج ۲، ص ۱۱/ مخزن العرفان در تفسیر قرآن، ج ۹، ص ۲۴۱.

آیت اللہ جوادی آملی کی نظر میں جادو کی اقسام

آیت اللہ جوادی آملی فرماتے ہیں: جادو ایک علم ہے جو کہ موضوع، محمول، اور مشخص تصوری اور تصدیقی مبادی رکھتا ہے نیز ایسے فکری مطالب رکھتا ہے جو کہ دوسروں تک قابل انتقال ہیں۔ جادو کا باطل ہونا اسکے علم نہ ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔[1]

وہ فرماتے ہیں: جادو کو بھی دیگر علوم کی مانند گوناگون رشتوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے کہ جو شدت اور ظرافت کے اعتبار سے یکساں نہیں ہیں۔[2] وہ مزید تصریح کرتے ہیں کہ جادو کی شدید اقسام وہ ہیں جن کو غالبا مرد عمل میں لاتے ہیں۔ مثال کے طور پر آیت اللہ جوادی آملی سورۃ الاعراف کی آیت ۱۱۶ (سحر واا عین الناس و جاؤا بسحرٍ عظیم) کو پیش کرتے ہیں کہ جس میں حضرت موسیٰ (ع) کے مقابلے میں مرد فرعونی جادوگروں کا ذکر ہے۔ آیت اللہ جوادی آملی کے مطابق جادو کی ظریف اقسام وہ ہیں کہ جن پر عورتیں عمل درآمد کرتی ہیں جیسا کہ سورۃ الفلق کی آیت ۴ (و من شرّ النفّاثات فی العقد) میں ذکر ہوا ہے۔

آیت اللہ جوادی آملی تفسیر تسنیم میں فرماتے ہیں کہ علوم غریبہ کی تقسیم بندی انتہائی دشوار کام ہے۔ البتہ وہ اپنے استاد علامہ طباطبائی کے قول سے استناد کرتے ہوئے علوم غریبہ کو پانچ اصلی اقسام میں تقسیم کرتے ہیں، جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:[3]

---

۱ تفسیر تسنیم، ج ۵، ص ۴۸۵۔
(سحر علمی است با موضوع، محمول و مبادی تصوری و تصدیقی مشخّص و مطلبی فکری و قابل انتقال بہ دیگران، و باطل بودن آن دلیل بر علم نبودن آن نیست.)
۲ تفسیر تسنیم، ج ۵، ص ۴۷۷.
(سحر همانند فنون علمی دیگر بہ رشتہ ہای گونہ گون تقسیم می شود کہ از لحاظ صلابت و ظرافت یکسان نیست.)
۳ تفسیر المیزان، ج ۱، ص ۲۴۴-۲۴۵. / تفسیر تسنیم، ج ۵، ص ۵۰۵.

۱. سیمیا: یہ وہ علم ہے جو امور طبیعی میں خاص قسم کا تصرف حاصل کرنے کے لئے ارادی قوتوں کی مادی قوتوں کے ساتھ آمیزش کے بارے میں بحث کرتا ہے۔ آیت اللہ جوادی آملی کے مطابق یہ علم جادو کے واضح ترین مصادیق میں سے ایک ہے۔

۲. لیمیا: یہ وہ علم ہے جو روح اور ارادے کی قدرت کی تاثیر کی اس کیفیت سے بحث کرتا ہے جو قوی اور بزرگ ارواح مثلاً ان فرشتوں کہ جو ستاروں پر موکل ہیں کے ساتھ روح اور ارادے کے ارتباط کے نتیجے میں وجود میں آتی ہے۔ یہ علم وہی فن تسخیر ہے کیونکہ اس علم کے وسیلے سے قوی ارواح یا جنوں کو تسخیر کرکے ان سے مدد لی جاتی ہے۔

۳. ہیمیا: یہ وہ علم ہے جو عجیب تاثیرات کو حاصل کرنے کے لئے عالم بالا کی قوتوں کے عالم پائین یعنی نچلے درجے کے عالم (دنیا) کے عناصر سے ملاپ کے بارے میں بحث کرتا ہے۔ اسے طلسمات بھی کہتے ہیں جو کہ ستاروں کے آپس میں ارتباط اور ان کے آسمان میں حالات کا مادی حوادث کے ساتھ ارتباط پر مبنی ہوتا ہے۔

۴. ریمیا: یہ وہ علم ہے جو بعض اثرات کے حصول کے لئے مادی قوتوں کے استعمال کے بارے میں بحث کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی انسان کے حواس پر یہ ظاہر ہو کہ کوئی کام خارق العادہ ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہ ہوا ہو۔ اسے شعبدہ کہتے ہیں۔

۵. کیمیا: یہ وہ علم ہے جو اس بات سے بحث کرتا ہے کہ بعض عناصر کیسے کسی دوسرے عناصر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

آیت اللہ جوادی آملی فرماتے ہیں کہ مندرجہ بالا علوم کو پانچ مخفی علوم (علوم پنج گانہ سرّی) کہا جاتا ہے۔ پھر وہ شیخ بہائی کے ایک قول کا ذکر کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک اس بارے میں بہترین کتاب "کلّہ سرّ" ہے کہ جس کا مشاہدہ انہوں نے ہرات میں کیا تھا۔ نیز ان علوم کی معتبر کتب مندرجہ ذیل ہیں: خلاصۃ کتب بلیناس، رسائل

خسروشاہی، الذخیرۃ الاسکندریۃ و السر المکتوم رازی، التسخیرات سکاکی، اور اعمال الکواکب السبعۃ حکیم طمطم ہندی۔[1]

اس کے بعد آیت اللہ جوادی آملی تین مزید علوم کو مندرجہ بالا پانچ علوم کے ساتھ ملحق کرتے ہیں۔[2] وہ تین علوم مندرجہ ذیل ہیں:

۱. علم اعداد و اوفاق: یہ وہ علم ہے جو کشف مطالب کے لئے اعداد اور حروف کے درمیان ارتباط سے بحث کرتا ہے۔ اس علم میں مناسب اعداد اور حروف کو مثلثی اور مربعی شکلوں کے مختلف جدول میں میں قرار دیا جاتا ہے (گویا یہ وہی علم جفر ہے).

۲. علم خافیہ: یہ وہ علم ہے کہ جس کے ذریعے کسی مطلوب شے کے نام کے حروف یا کسی انسان کو مطلوب کسی شے کے مناسب کسی اور شے کے نام کے حروف کو توڑا یا (آپس میں ملایا) جاتا ہے اور اس طریقے سے آسمان کے ان فرشتوں یا شیاطین کے نام حاصل ہوتے ہیں کہ جو اس مطلوب پر موکل ہوا کرتے ہیں۔ اس وقت اس دعا کو پڑھنے سے جو ان اسماء سے تشکیل پاتی ہے انسان کو اپنا مطلوب حاصل ہو جاتا ہے۔ اس علم کے بارے میں لکھی گئی معتبر کتب میں وہ کتب شامل ہیں جو شیخ ابوالعباس التونی اور سید حسین اخلاطی نے تحریر کی ہیں۔

۳. علم احضار ارواح اور مقناطیسی نیند (یعنی ہپنوٹزم): اس علم کی بنیاد ارادے کی خیال میں تاثیر اور تصرف ہے اور اس بارے میں بہت سی کتب اور رسالے لکھے جا چکے ہیں۔

---

۱ تفسیر تسنیم، ج۵، ص ۵۰۵.

۲ تفسیر المیزان، ج۱، ص ۲۴۴-۲۴۵/ تفسیر تسنیم، ج۵، ص ۵۰۵.

دونوں مفسروں کے نظریات کا خلاصہ اور موازنہ

تحقیق کے اس حصے میں جادو کے مفہوم اور اُسکی ماہیت نیز جادو کی اقسام کے بارے میں دونوں مفسروں کے نظریات کا خلاصہ اور اُن کے نظریات کے درمیان نکات اشتراک وافتراق کو مختصر طور پر بیان کیا جاتا ہے۔

جادو کا مفہوم اور اُسکی ماہیت

سیدہ نصرت امین کی نظر میں جادو کے مفہوم اور ماہیت کو مندرجہ ذیل نکات کی صورت میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے۔

جادو کا سبب مخفی ہوتا ہے۔
جادو فریب اور دھوکے پر مبنی ہوتا ہے۔
جادو واقعیت رکھتا ہے لیکن اس کا تصرف غیر واقعیات یعنی دیکھنے والوں کی حس یا تخیل میں ہوا کرتا ہے نہ کہ اشیاء کی حقیقت میں۔
جادو کی بنیاد باطنی قوتیں اور جادوگر کے نفس کا شر ہوتا ہے۔

جہاں تک آیت اللہ جوادی آملی کی نظر میں جادو کے مفہوم اور ماہیت کا تعلق ہے تو انکے نظریات کو مندرجہ ذیل نکات کی صورت میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے۔

جادو خارق العادہ علوم میں سے ایک قابل انتقال اور قابل تعلیم علم ہے۔
جادو کی علل غیر محسوس اور غیر مادی ہوا کرتی ہیں۔
سحر حق اور باطل کے مخلوط ہونے کا معنی دیتا ہے لہٰذا جادو کے بارے میں پتہ نہیں چلتا کہ وہ حق ہے یا باطل۔
جادو کا ہدف شیاطین کی دوستی اور معاونت حاصل کرنے کے لئے دھوکہ دہی کے ذریعے دوسروں کو نقصان پہنچانا ہے۔

سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۰۲ میں سحر خیال پردازی اور شعبدہ نہیں ہے بلکہ واقعیت رکھتا ہے کہ اس کے انجام کے ذریعے شیاطینِ جن کی معاونت اور دوستی حاصل ہوتی ہے۔

خارق العادہ اعمال، چاہے ان پر جادو کا اطلاق ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو، قدرت ارادہ اور قدرت روح کی بنا پر وجود میں آتے ہیں۔

نکات اشتراک

دونوں مفسروں کے نظریات کے درمیان مندرجہ ذیل نکات مشترک ہیں:

جادو کی علل یا اس کے اسباب مخفی ہوتے ہیں۔

جادو دھوکہ دہی پر مبنی ہوتا ہے۔

جادو واقعیت رکھتا ہے۔

نکات افتراق

دونوں مفسروں کے جادو کے مفہوم اور ماہیت کے بارے میں نظریات میں مندرجہ ذیل فرق پائے جاتے ہیں:

آیت اللہ جوادی آملی نے جادو کا ہدف شیاطین کی دوستی اور معاونت حاصل کرنے کے لئے دھوکہ دہی کے ذریعے دوسروں کو نقصان پہنچانے کو جادو کا ہدف قرار دیا ہے جبکہ سیدہ نصرت امین نے جادو کے ہدف کے سلسلے میں ایسا کچھ ذکر نہیں کیا بلکہ جادو کے عمل کو اُس کے کے اسباب کے مخفی ہونے اور اُس کے دھوکے کے ہمراہ ہونے سے مشروط کیا ہے۔

سیدہ نصرت امین کے مطابق جادو کی بنیاد جادوگر کے نفس کا شر ہوتا ہے جبکہ آیت اللہ جواد آملی کے مطابق ہر خارق العادہ عمل، چاہے اس پر جادو کا اطلاق ہو یا نہ ہو، روح کی قوت کی وجہ سے انجام دیا جاتا ہے۔

آیت اللہ جوادی آملی نے جادو کے اصطلاحی معانی بیان نہیں کئے جبکہ سیدہ نصرت امین کے مطابق جادو کے اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ شریعت کے عرف میں ایسا عمل (یعنی جادو) مذموم ہے کہ جس کا سبب مخفی ہو اور وہ فریب دینے کے لئے کیا جاتا ہو اور انسان کے تخیل میں وہ چیز پیش کرتا ہو جو حقیقت کے خلاف ہو۔ پس جادو کے اصطلاحی معنی بیان کرتے ہوئے بھی سیدہ نصرت امین نے سحر کے لغوی معنی سے استفادہ کیا ہے۔

جادو کی اقسام

سیدہ نصرت امین کے مطابق جادو کی بہت سی اقسام اور ان گنت شاخیں ہیں۔ البتہ انہوں نے جادو کو غیر علمی اور علمی اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ انہوں نے جادو کی چار غیر علمی اقسام بیان کی ہیں: ایک قسم وہ ہے کہ جس کا علوم طبیعی سے تعلق ہے اور اس کا سبب عام لوگوں کو پتہ نہیں ہوتا، دوسری قسم وہ ہے جو کثرت عمل اور تمرین کی وجہ سے کی جاتی ہے، تیسیر قسم وہ ہے جو شعبدہ ہے، جبکہ چوتھی قسم وہ ہے جو قوت نفس اور ارادے کے عزم کی بنا پر انجام دی جاتی ہے اور وہ خارق العادت ہے۔ اسی چوتھی قسم میں سیدہ نصرت امین نے احضار ارواح، تسخیر جن، اور مقناطیسی نیند کو بی شامل کیا ہے اور بحثیت مجموعی اسے علم لیمیا کہا ہے۔ نیز سیدہ نصرت امین نے جادو کے علم ہونے کے اعتبار سے اسکی سات اقسام کو بیان کیا ہے جن میں سے ایک علم لیمیا بھی ہے۔ وہ سات اقسام یہ ہیں: علم شیمیا، علم لیمیا، علم ہیمیا جسے علم طلسمات بھی کہتے ہیں، علم دیمیا یعنی شعبدہ، علم کیمیا، اور آن علوم سے ملحق دو مزید علوم یعینی علم اعداد و او قاف اور مقناطیسی نیند و احضار ارواح۔

آیت اللہ جوادی آملی کے مطابق جادو کی بہت سی اقسام ہیں جن میں سے کچھ شدید اور کچھ لطیف ہیں۔ جادو کی شدید اقسام کو غالباً مرد انجام دیتے ہیں اور لطیف اقسام کو عورتیں۔ آیت اللہ جوادی آملی نے اپنے استاد علامہ طباطبائی سے استناد کرتے ہوئے جادو کی بحث میں علوم غریبہ کی پانچ اصلی اقسام اور اُن سے ملحق تین اقسام کا ذکر کیا ہے۔ وہ علوم مندرجہ ذیل ہیں: علم سیمیا جو جادو کی واضح ترین قسم ہے، علم لیمیا، علم ہیمیا (علم طلسمات)، علم

ریمیا (شعبدہ)، علم کیمیا، اور ان سے ملحق علم اعداد و اوفاق (علم جفر)، علم خافیہ، اور علم احضار ارواح و مقناطیسی نیند۔ پس آیت اللہ جوادی آملی نے صرف جادو کے علم ہونے کے اعتبار سے اس کی اقسام کو بیان کیا ہے۔

نکات اشتراک

دونوں مفسروں نے جادو کے علم ہونے کے اعتبار سے تقریبا ایک جیسے علوم کا ذکر کیا ہے۔

نکات افتراق

آیت اللہ جوادی آملی نے جادو کی صرف علمی اقسام کا ذکر کیا ہے جبکہ سیدہ نصرت امین نے غیر علمی اقسام کا بھی ذکر کیا ہے۔

آیت اللہ جواد آملی نے جادو کی علمی اقسام کا ذکر کرتے ہوئے علم اعداد و اوفاق کی تصریح کرتے ہوئے اسے علم جفر کہا ہے جبکہ سیدہ نصرت امین نے ایسی کوئی تصریح پیش نہیں کی۔ نیز آیت اللہ جوادی آملی نے جادو کی علمی اقسام میں علم خافیہ کو بھی ذکر کیا ہے جس کا ذکر سیدہ نصرت امین نے نہیں کیا۔

نتیجہ

اس مقالے میں سحر یعنی جادو کے مفہوم، ماہیت، اور اُسکی اقسام کے بارے میں تفسیر مخزن العرفان کی مولفہ سیدہ نصرت امین اور تفسیر تسنیم کے مولف آیت اللہ جوادی آملی کے نظریات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ سیدہ نصرت امین نے اپنی تفسیر میں جادو کے لغوی اور اِصطلاحی دونوں معانی پر بحث پیش کی ہے۔ اُنکی نظر میں جادو وہ عمل ہے جس کا سبب مخفی ہوتا ہے اور وہ فریب کے ہمراہ ہوتا ہے۔ اُن کے مطابق جادو واقعیت رکھتا ہے لیکن اس کا تصرف غیر واقعیات یعنی دیکھنے والوں کی حس یا تخیل میں ہوا کرتا ہے نہ کہ اشیاء کی حقیقت میں۔ نیز اسکی بنیاد جادوگر کے نفس کا شر ہوتا ہے۔ آیت اللہ جوادی آملی نے اپنی تفسیر میں جادو کے اِصطلاحی معانی کی جانب کوئی

اشارہ نہیں کیا۔ بلکہ صرف لغوی اعتبار سے اس کی بررسی کی ہے۔ اُن کے مطابق جادو خارق العادہ علوم میں سے ایک قابل انتقال اور قابل تعلیم ہے جو کہ غیر محسوس اور غیر مادی اور مبادی علل اور مبادی رکھتا ہے اور اسکا ہدف شیاطین کی دوستی اور معاونت حاصل کرنے کے لئے دھوکہ دہی کے ذریعے دوسروں کو نقصان پہنچانا ہے۔ نیز خارق العادہ اعمال، چاہے ان پر جادو کا اطلاق ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو، قدرت ارادہ اور قدرت روح کی بنا پر وجود میں آتے ہیں۔ سیدہ نصرت امین نے جادو کے علمی اور غیر علمی دونوں اعتبار سے اقسام کو بیان کیا ہے جبکہ آیت اللہ جوادی آآلی نے صرف علم ہونے کے اعتبار سے جادو کی اقسام کو بیان کیا ہے۔ دونوں مفسروں کے جادو کے مفہوم، ماہیت، اور اُسکی اقسام کے بارے میں نظریات میں کئی نکات اشتراک اور افتراق پائے جاتے ہیں جن کو اس مقالے میں بیان کیا گیا ہے۔

مصادر

۱. امین، سیدہ نصرت، مخزن العرفان در تفسیر قرآن، تہران، نہضت زنان مسلمان، ۱۳۶۱ش۔

۲. ۲۹۲-۲۹۸

۳. جوادی آملی، عبداللہ، تفسیر تسنیم، تفسیر قرآن کریم، قم، مرکز نشر اسراء۔

۴. جوہری فارابی، اسماعیل بن حماد، الصحاح (تاج اللغۃ وصحاح العربیۃ)، قاھرہ (بی تا)۔

۵. فیروز آبادی، محمد بن یعقوب، القاموس المحیط، بیروت، مؤسسۃ الرسالۃ للطباعۃ والنشر والتوزیع، ۱۴۲۶ھ۔

۶. طباطبایی، محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، قم، منشورات جماعہ المدرسین۔

۷. Frazer, J. in F.B. Jevons, Magic and Religion, ۱۹۱۷, Folklore, vol. ۲۸, no. ۳۰, p. ۲۵۹-۲۷۸.

۸. Frazer, J. in M. Titiev, A fresh approach to the problem of magic and religion, ۱۹۶۰, Southwestern Journal of Anthropology, vol. ۱۶, no. ۳,

۹. Rytter, M. In-Laws and Outlaws: Black Magic among Pakistani Migrants in Denmark, ۲۰۱۰, The Journal of the Royal Anthropological Institute, vol. ۱۶, no. ۱, p. ۶۳-۴۶

طریقے کے بچنے سے اس اور دخالت کی اسرائیلیات میں تفسیر

طیبہ اسماعیل[۱]

تمہید

قرآن مجید کے علاوہ اور جتنی آسمانی کتابیں جو مختلف ادوار میں مختلف انبیاء پر نازل ہوتی رہی ہیں ان میں سے کوئی کتابیں اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں ۔کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ یہ وہی نسخہ ہے جسے اللہ نے اپنے پیغمبروں پر نازل کیا تھا۔ آج زبور کے ماننے والوں کا وجود نظر نہیں آتا۔البتہ توریت کے ماننے والے یہودی اور انجیل کے ماننے والے عیسائیوں کی بڑی تعداد آج ساری دنیا میں پائی جاتی ہے۔لیکن ان کا کوئی بڑے سے بڑا عالم بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ان کے پاس تورات یا انجیل کی کتابوں کہ وہی نسخے ہیں جو حضرت موسی علیہ السلام اور حضرت عیسی علیہ السلام پر نازل ہوئے حتی کہ حضرت عیسی پر انجیل کی ایک کتاب نازل ہوئی مگر عیسائیوں میں انجیل کے نام سے چار کتابیں موجود ہیں جن میں آپس میں بہت سے اختلافات موجود ہیں ۔نیز توریت اور انجیل حضرت موسی اور حضرت عیسی کی وفات کے بعد بہت لمبے عرصے کے بعد لکھی ہوئی صورت میں جمع کی گئ

۔حقیقت کچھ یوں ہے کہ قطعی دلائل سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ آسمانی کتابوں میں اس قدر تحریف و ترمیم ہو چکی ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیاکے اس میں سے کونسا حصہ اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے اور کون سی تحریفات بعد کے لوگوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کی ہیں ۔آسمانی کتابوں میں علمائے یہود و نصاری نے کتنی خیانت کی ہے کوئی بھی اسے علیحدہ نہیں کر سکتا ۔ قرآن مجید وہ واحد کتاب ہے جو اپنے نازل ہونے کے وقت سے اب تک اور تا قیامت کسی بھی قسم کی

---

۱ ۔ایم۔ فل تفسیر وعلوم قرآن، المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

آمیزش ، کمی بیشی اور حذف و اضافہ سے محفوظ رہے گی ۔کیونکہ خدا نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے اور آج بھی اس کا ایک ایک حرف اور ایک ایک نقطہ ٹھیک اسی حالت میں ہے جس طرح رسول اکرم پر نازل ہوا تھا۔

تاریخی تفسیر کی تعریف اور اہمیت

مقاییس اللغہ کے مطابق فسر ایک ایسا کلمہ ہے جو کسی چیز کو بیان کرنے اور اس کی وضاحت کرنے پر دلالت کرتا ہے۔بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ فسر کے معنی کسی پوشیدہ چیز سے پردہ ہٹانے کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ فسر کے معنی وہی ہیں جو تفسیر کے ہیں اور تفسیر کے معنی)کتاب کے مطالب کو جدا کرنے اور بیان کرنے ہیں(بعض نے کہا ہے کہ تفسیر کے معنی مشکل الفاظ سے پردہ ہٹانے کے ہیں۔ لہٰذا تفسیر سے مراد آیات قرآنی کلام الہی جو آیات قرآن کی شکل میں پیغمبر اکرم پر نازل ہوا ہےان سے استنباط مہارت حاصل کرنا ہے ۔لہٰذا قرآنی آیات کے معنی کو سمجھنا اور خداوند متعال کی مراد حقیقی) مقاصد آیات (یعنی آیات کے مقاصد کو سمجھنا ہے ۔کلمہ تفسیر تاویل اور خواب کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے ۔التحقیق میں بیان ہوا ہے کہ فسر کے اصل مادہ کے معنی توضیح کے ساتھ تشریح کرنے کے ہیں۔ تفسیر ہ جیسے بیماری کو سمجھنے کے لئے طبّی جانچ کی جاتی ہے۔

اہل لغت کے تمام مطالب سے پتہ چلتا ہے کہ کلمہ تفسیر میں کچھ بنیادی عناصر پوشیدہ ہیں ۔

ایک۔ مبہم الفاظ کی تشریح و توضیح اور پوشیدہ امور سے پردہ ہٹانا

دو ۔مطالب کو جدا کرکے معنی کو بیان کرنا اور ظاہر کرنا ۔

علامہ طباطبایی کے مطابق تفسیر یعنی آیات قرآن کے معنی بیان کرنا اور ان کے مقاصد کو کشف کرنا ہے۔

آیت اللہ خوئی کے مطابق تفسیر سے مراد خداوندعالم کے مقصد کو واضح کرنا ہے جیسا کہ تفسیر کے معنی پردہ اٹھانے کے ہیں۔لہٰذا قرآن کے ظاہری معنی تفسیر نہیں کیونکہ وہ پوشیدہ نہیں ہیں۔

لہٰذا آیات قرآن سے خداوند متعال کی مراد اور مقصد بیان کرنا اور اس کی وضاحت کرنا اور اس کو کشف کرنا تفسیر کہلاتا ہے ۔یا ہم اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایسے اقدامات اور منابع کی وضاحت جو آیات قرآن کے کشف تشریح اور وضاحت کے سلسلے میں تحریر کیے گئے ہیں ۔قرآن کی ابتدا سے آج تک لکھی جانے والی تفاسیر میں ہر صدی میں تفسیر میں آنے والی تبدیلیاں، تفسیر کی تدوین میں مختلف روشیں نیز مفسرین اور علم رجال کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔تاریخ تفسیر کی اہمیت میں تفسیر کی اقسام نیز مفسرین کے حالات اور تفاسیر کا حجم ،مختلف تفاسیر کی روشیں مثلا عرفانی ،کلامی روائی و غیرہ شامل ہیں۔نیز تفسیر میں مفسرین کی اپنی مذہبی عقائد کے مطابق قرآن کی تفسیر کرنا بھی شامل ہے خصوصا تفسیر روائی میں اسرائیلیات کا بھی ایک اہم مسئلہ ہے ۔علاوہ ازیں ایک صدی تک مسلسل روایات پر پابندی نے بھی بہت سی مشکلات کو جنم دیا ۔کیونکہ قرآن کلی طور پر بیان کیا گیا ہے لیکن تفاسیر میں پیغمبر سے ان کی تفصیل منقول ہے ۔

حدیث نویسی کے بانی افراد میں یزید بن ہارون سلمہ ابان بن تغلب شعبہ بن حجاج اور دیگر افراد کو سمجھا جاتا ہے۔[۱]

بعض محققین نے ابن عباس کو تفسیر تدوین کرنے والا پہلا شخص قرار دیا ہے ۔[۲]

بعض مورخین کے مطابق فرانخوی نے سب سے پہلے تفسیر کی تدوین کی۔[۳]

۱.ر ک محمد حسین ذہبی ۔التفسیر والمفسرون

۲ ۔طبری جامع البیان محمد بن جریر طبری

۳ ۔ابن ندیم الفہرست

تفسیر کی اقسام

تفسیر موضوعی

تفسیر ترتیبی

تفسیر کی روشیں

تفسیر قرآن بالقرآن

تفسیر روائی

تفسیر عقلی یا تفسیر بالرائے

تفسیر اجتہادی

تفسیر قرآن بالقرآن

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر کی روش کا آغاز خود تفسیر قرآن کے آغاز سے ہی ہوتا ہے ۔کیونکہ پیغمبر اسلام قرآن کی تبیین اور وضاحت کے لئے دیگر آیات سے استفادہ فرماتے تھے ۔اس طرح تفسیر قرآن بالقرآن کا آغاز ہوا پھر آپ کی بیان کردہ روایات سے صحابہ و ائمہ اہل بیت نے تفسیر میں استفادہ کیا تو تفسیر القرآن بالروایہ کا آغاز ہوا ۔اس طرح یہ سلسلہ جاری و ساری رہا اور دوسری صدی ہجری اور اس کے بعد کے مختلف علوم کی وجہ سے تفسیر کے مختلف روشوں میں اضافہ ہوتا رہا۔

تفسیر روایات کی اہمیت اور اعتبار

مسلمان مفسرین کے مطابق پیغمبر اسلام ابلاغ وحی کے علاوہ کلام خدا کی تفسیر ،تبین اور تشریح کے بھی ذمہ دار تھے۔[1]

۱۔ایازی المفسرون حیاتھم و منھجم ۱۴۱۴ھ۔ ص ۳۶

وہ اپنی اس رائے کے لیے سورۃ النحل کی آیت نمبر ۴۴ اور ۶۴ سے استدلال قائم کرتے ہیں ۔[۱]
اس بنا پر شیعہ اور سنی مفسرین کا یہ عقیدہ ہے کہ پیغمبر سے منسوب تفسیری روایات یا کلمات کی صحت ثابت ہونے کی صورت میں یہ تفسیر کی ایک بہترین اور محکم ترین روش ہے ۔[۲]
اہل تشیع نے حدیث ثقلین سے استدلال کرتے ہوئے ائمہ کی روایات کو بھی تفسیر روائی کے منابع میں سے قرار دیا ہے ۔[۳]
تفسیری روایات کی اہمیت کے باوجود مفسرین کے نزدیک مذکورہ احادیث کے ضمن میں جعلی روایات بھی موجود ہیں جنہیں کسی نہ کسی صحابی کے مقام و منزلت کو بڑھانے یا گھٹانے کے لیے جعل کیا گیا ہے ۔[۴]
سورہ توبہ کی آیت نمبر ۱۱۳ کے لیے شان نزول کا جعل ان مواد میں سے ایک ہے۔ اور اہلسنت مفسر طبری اور بخاری نے بھی اسے جعلی قرار دیا ہے ۔[۵]
مذکورہ شان نزول کی بنیاد پر سورۃ توبہ کی آیت نمبر ۱۱۳ کو امام علی کے والد گرامی حضرت ابو طالب کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ ان کی موت کے وقت نازل ہوئی اور آخری لحات تک ان کے شرک پر باقی رہنے کو بیان کر رہی ہے جبکہ طبری اور بخاری کے نزدیک ابو طالب ہجرت سے تین سال قبل وفات پا چکے تھے جب کہ یہ آیت سن ۹ ہجری کو نازل ہوئی ہے ۔[۶]

۱۔ایازی المفسرون حیاتھم و منہجم ۱۴۱۴ ہجری صفحہ ۳۶
۲۔شیخ طوسی التبیان فی تفسیر القرآن بیروت ج ۶ ۔ص۳۹۸ فخر رازی التفسیر الکبیر قاہرہ ج۳۰ ص ۵۷۔ طباطبائی المیزان فی تفسیر القرآن بیروت ج۱۲ ص ۲۸۴۔
۳۔ایضا
۴۔بخاری صحیح البخاری ۱۴۰۱ھ ج۵ص۲۰۸طبری جامع البیان ۱۳۳۰۔ ۱۳۲۲ھج۷ص۳۰
۵۔ایضا
۶۔ذہبی الاسرائیلیات فی التفسیر و الحدیث ۔۱۴۰۵ھ ص۱۹

اس قسم کی جعلی روایات کے جس میں اکثر و بیشتر نومسلم یہودیوں کے توسل سے جاری کی گئی ہیں ا نہیں اسرائیلیات کہا جاتا ہے۔

تفسیر روائی کے چند نمونے

یعنی قرآنی محقق اور مفسر محمد ہادی معرفت کے نزدیک اسلام کی اہم ترین تفسیر روای درج ذیل ہیں۔[1]

تفسیر عیاشی۔۔۔چوتھی صدی کے شیعہ فقیہ، محمد بن عمر کشی کے استاد محمد بن مسعود العیاشی کی تالیف ہے۔عیاشی نے اپنی تفسیر میں سے شیعہ علماء سے منقول روایات کو بھی سند کے ساتھ روایت کیا ہے[2]۔لیکن تفسیر عیاشی کے چندحصے ہماری دسترس میں نہیں ہیں۔[3]

تفسیر قمی علی بن ابراہیم قمی سے منسوب ہے جس سے ان کے شاگرد ابو الفضل عباس بن محمد بن امام موسی کاظم کی اولاد سے تھے میں تالیف کیا علی بن ابراہیم کے شاگرد ہونے کے سوا ابو الفضل العباس بن محمد کے بارے میں کسی قسم کی معلومات دستیاب نہیں ہیں ہے[4]۔انہوں نے علی بن ابراہیم کے توسط سے نقل ہونے والی روایات کے علاوہ تفسیر ابوالجارود سے بھی استفادہ کیا ہےاگرچہ مجموعی طور پر اس تفسیر کو بلاا شکال قرار دیا گیا ہے مگر اس میں کچھ مقامات پر ضعیف روایات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔[5]

۱۔معرفۃ التفسیر والمفسرون فی ثوبہ القشیب ۱۴۱۹ھ ج۲ص ۳۱۲

۲۔ایضا

۳۔معرفۃ التفسیر والمفسرون فی ثوبہ القشیب ۱۴۱۹ھ ج۲ص ۳۲۲

۴۔ایضا، ص ۳۲۵

۵۔ایضا، ص ۳۲۶

جامع البیان ۔ ۔اہلسنت و مفسر محمد بن جریر طبری کی تالیف ہے تفسیر کی جامعیت اور ہمہ جہتی کے تبار سے تبلیغ کو علم تفسیر کا باپ قرار دیا گیا ہے ۔[1] البتہ طبری پر جعلی اور ضعیف روایات کے ذکر اور مجہول راویوں پر اعتماد کرنے کا بھی الزام ہے۔

تفسیر روائی کی مشکلات

اسرائیلیات کا وجود

تفسیری روایات میں تناقص

جعلی روایات

بعض روایات کا مستند نہ ہو ناایسی روایات جو خود تفسیر کی محتاج ہیں

متون تفسیر سے ضعیف روایات کا جدا نہ ہونا

اعتقادات میں خلل پیدا کرنے والی روایات

اسرائیلیات معنی و مفہولغت میں لفظ: اسرائیلیات) :اسرائیلیہ (کی جمع ہے اسرائیل یعقوب پیغمبر کا لقب ہے کیونکہ یہودیوں کی نسبت ان کی طرف دی جاتی ہے اس نے" بنی اسرائیل "کہا جاتا ہے

لفظ اسرائیل در واقع عبری ہے اور" خدا پر غلبہ "کے معنی میں ہے

آیت اللہ معرفت اسرائیلیات کی تعریف کے سلسلے میں لکھتے ہیں

۱۔ایضاء ص ۳۲۷

ھی قصہ او اسطورہ تروی عن مصدر اسرائیلی۔ سواآکان من کتاب او مشخص، تنتھی الیہ سلسلہ اسناد القصہ ۔[۱]

تفسیر میں اسرائیلیات کی دخالت اور اس سے بچنے کے طریقے۔

اسرائیلیات اسلامی اصطلاح میں جہ ان روایات کو اسرائیلیات

سے منسوب کیا جاتا ہے کہ جن کا سرچشمہ یہودیت ہے

یہودیوں کی اسلام دشمنی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ ظاہری اسلام کے لبادے میں اسلام ہی کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے لگے اور یہودی سماج میں پھیلی ہوئی انبیاء علیہ السلام کے متعلق من گھڑت باتوں کو مسلمانوں کی مجالس میں بیان کرنے لگے ۔تاکہ مسلمانوں کے صحیح و سالم عقائد میں شکوک و شبہات کے بیج بو دیے جائیں ان تمام دجل وفریب میں یہودیت کا رنگ جھلکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان روایتوں کو اسرائیلیات اس سے منسوب کیا جانے لگا۔

علاوہ اذیں ان واقعات وقصص پر بھی ان کا اطلاق ہونےلگا جن کا اصل منبع یہودیت تو نہیں بلکہ ان روایات کو گھڑنے وضع کرنے والے منافقین اور مشرکین بشمول نصاریٰ ہیں ۔انہوں نے قرآن مجید کے ان واقعات کو جنہیں مختصر طور پر بیان کیا گیا تھا اس کی تفصیلات میں جھوٹے قصے مہمل باتیں خلاف عقل مشاہدہ اور محیرالعقول واقعات بیان کرکے مسلمانوں میں پھیلا دیئے تاکہ قرآن مجید کی بے داغ صداقت بڑی آسانی سے داغدار کی جاسکے۔

جیسے قصہ غرانیق جو اصل میں یہودیوں کا تراشیدہ نہیں ہے بلکہ زنادقہ کا وضع کردہ ہوا افسانہ ہے ۔اسی طرح جب زینب بنت جحش کا واقعہ بھی مشرکین کا گھڑا ہوا ہے لیکن اصطلاح میں ان روایتوں کو بھی

۱۔ ایضا، ص ۳۱۲، ۳۱۳

اسرائیلیات میں شمار کیا گیا ہے۔ کیونکہ ہر وہ واقعہ جو جس میں یہودی کارنگ جھلکتا ہے جو یہودی ذہن کی ترجمانی کرتا ہے اصطلاحا اسرائیلیات کے زمرے میں ہی آئے گا۔
مسلمانوں میں اسرائیلی روایات کا دخل مختلف طریقوں سے ہوا اول عرب تجار کے یمن اور شام کے تجارتی اسفار جہاں یہودی اور اہل کتاب کی اکثریت تھی نتیجہ یہ نکلا کہ عربوں اور یہودیوں میں قربت پیدا ہوتی چلی گئیں اور پھر عرب اپنی بدویت اور ان پڑھ ہونے کی وجہ سے ان کی تہذیب و تمدن اور مذہبی روایات سے مرعوب ہونے لگے اور ان کے دلوں میں یہودیوں کے لئے نرم گوشہ ضرور پیدا ہو گیا۔
یہ حقیقت ہے ظہور اسلام کے بعد سب سے بڑی یہ تبدیلی ہوئی کہ یہودیوں کے مشہور علماء میں سے کئی ایک نے اسلام قبول کرلیا جیسے عبداللہ بن السلام عبدالرحمٰن صوریہ یہ لوگ توریت کے عالم تھے اور روایات توریت سے بخوبی واقف تھے۔ مسلمان قرآن کے مجمل واقعات کی تفصیل ان شخصیات سے پوچھتے تو یہ ان کو یہودی مذہب کی جو روایات معلوم ہوتی تھی وہ بیان کر دیتے۔ اس طرح اسلامی روایات میں اسرائیلی روایات مخلوط ہوگئیوہ لوگ جو پہلے اہل کتاب میں یہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے جب مشرف بہ اسلام ہوئے تو قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی تو نے قرآن کریم میں پچھلی امتوں کے بہت سے واقعات نظر ہے جو انہوں نے اپنے سابقہ کتابوں میں بھی پڑھتے تھے جہاں وہ لوگ قرآنی واقعات کے سلسلے میں وہ تفصیلات مسلمانوں کے سامنے بیان کرتے تھے جو انہوں نے اپنے پرانے مذہب کی کتابوں میں دیکھی تھی اور یہی تفصیلات اسرائیلیات کے نام سے تفسیر کی کتابوں میں داخل ہوگی۔ اسرائیلیات کی حدیثی لٹریچر میں دخل اندازی سے حصہ گو واعظین اور منافقین کی سازشیں اور فرضی سندوں کا عنصر نمایاں ہے۔

حافظ ابن کثیر نے جو بڑے محقق مفسرین میں سے ہیں)بحوالہ مقدمہ تفسیر ابن کثیر(اسرائیلیات کی تین قسمیں بیان کی ہیں

اول وہ روایات جن کی سچائی قرآن وسنت کے دوسرے دلائل سے ثابت ہے مثلا فرعون کا غرق ہونا حضرت موسی کا کوہ طور پر جانا

دوم وہ روایات جن کا جھوٹ ہونا قرآن و سنت کے دوسرے دلائل سے ثابت ہے۔مثلا اسرائیلی روایات میں مذکور ہے کہ حضرت سلمان اپنی آخری عمر میں مرتد ہوگئے تھے جبکہ ان کی تردید قرآن سے ثابت ہے۔

ترجمہ۔سلیمان نے کوئی کفر نہیں کیا بلکہ کفر تو شیطانوں نے کیا) سورہ بقرہ آیت نمبر ۱۰۲(اسی طرح اسرائیلی روایات میں مذکور ہے کہ حضرت داؤد نے اپنے سپہ سالار اوریا کی بیوی سے زنا کیا اور اوریا کو مروا کر اس کی بیوی سے نکاح کرلیا یہ کھلا جھوٹ ہے اور اس قسم کی روایتوں کو سمجھنا گناہ ہے ۔

وہ روایات جن کے بارے میں قرآن و سنت اور دوسرے شرعی دلائل خاموش ہیں جیسے تورات کے احکام غیرہ ایسی روایات کے بارے میں یہی کہا گیا ہے کہ اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا جائے ان کی تصدیق کی جائے نہ تکذیب ۔اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کیا ایسی روایات کو نقل کرنا جائز بھی ہے یا نہیں ۔

نیز آیت اللہ معرفت نے ڈاکٹر ذہبی کے قول کو نقل کرتے ہوئے کہ جس میں انہوں نے اہل کتاب سے سوال کرنے والی آیت سے ان کے رجوع کرنے کو جائز ہونے کا استدلال کیا ہے[1] ۔ لکھتے ہیں

ھذہ الدلایل غیر واقعیہ باثبات المطلوب، ولاھی تبرر مراجعہ اھل الکتاب فی شیی من تفسیر القرآن الحکیم او تاریخ الانبیا۔

اہل کتاب کی طرف رجوع کرنے کے طریقے

تفسیر قرآن میں استفادہ کرنے کے لئے اہل کتاب کی طرف مراجعہ کرنے کے مختلف طریقے ہیں اور ہر ایک کا خاص حکم ہے

۱۔ سورہ انبیاء آیت ۷ سورہ نحل آیت ۴۷

الف تفسیر قرآن کے ماخذ کے عنوان سے اہل کتاب سے سوال کرنا
جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ تورات اور انجیل تحریف شدہ ہیں اور ان میں بعض مواقع پر غیر واقعی اور خرافی مطالب وارد ہوئے ہیں۔اس وجہ سے اسے تفسیر قرآن کا معتبر ماخذ قرار نہیں دیا جاسکتا لہٰذا آیات قرآن کی تفسیر کے سلسلے میں شارحین تورات و انجیل یعنی یہود اور مسیحیت کے دانشوروں سے سوال نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ بھی غیر معتبر اور تحریف شدہ مصادر سے جواب دیں گے ۔

اسرائیلیات کو نقل کرنے والی اہم شخصیات

کعب الاحبار

ابوہریرہ

عبداللہ بن عیاش

عبداللہ بن سلام

تمیم داری

وہب بن منبہ

محمد بن سائب کلبی

عبدالمالک بن عبدالعزیز بن جریح

مقاتل بن سلیمان

محمد بن مروان السدی

کعب الاحبار

کعب بن ماتع الحمیری۔ ایک بہت بڑا یہودی دانشور تھا علم کہانت کو اس نے اپنے باپ سے سیکھا تھا ۔ہجرت سے بہتر سال پہلے پیدا ہوا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عمر کی خلافت کی ابتدا میں مسلمان ہوا ۔۔سن بتیس ہجری میں ۱۰۴ سال کی عمر میں وفات پائی۔

وہ یمن کا رہنے والا تھا اسلام قبول کرکے مدینہ آیا امام علی علیہ السلام نے اسے جھوٹا کہا اور اس کی مذمت کی جھوٹ بولنے اور جھوٹ حدیث کی وجہ سے عمر نےاسے حدیث نقل کرنے سے منع کر دیا اور اس کے شہر بدر کرنے کی دھمکی دی ۔[۱]

اس کے بعد وہ شام چلا گیا اور معاویہ نے اس کی حمایت کی [۲]۔اور اس کو زمین شام میں لوگوں کے لئے قصہ کہنے پر مامور کیا یہی سے اسرائیلی احادیث اسلامی دنیا میں داخل ہوگی ۔[۳]

احمد امین مصری[۴] اور محمد ابوریہ[۵] نے اس کی بہت زیادہ مذمت کی ہے ابوریہ کا ماننا ہے کہ کعب الاحبار دھوکہ دینے کے لئے مسلمان ہوا اور نا معتبر دینی کتابوں سے نقل کرتا تھا اسے شام)اسرایئل اور اس کے اطراف(کے سلسلے میں بہت زیادہ روایات نقل کی ہیں جن کا شمار نا معتبر اسرائیلیات میں کیا جاتا ہے۔

---

۱ ۔تاریخ ابو زرعۃ الدمشقی ج ۱ ص ۵۴۴۔ البدایہ و النہایہ ابن کثیر ج ۸ ص ۱۰۸ ۔سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۴۴۰

۲ ۔ تہذیب التنذیب ج ۸ ص۴۳۹

۳ ۔التفسیر والمفسرون فی ثوبہ القشیب ج۲ ۹۷ اضواء علی السنۃ المحمدیۃ ص۱۸۱

۴ ۔۔ فجر الاسلام ص۱٦٠۔ ۱٦۱

۵ ۔اضوا علی السنۃ المحمدیہ ص۱۷۰۔ ۱۸۱۔

ابن حجر نے نقل کیا ہے کہ ابو ہریرہ معاویہ عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے کعب الاحبار سے حدیث نقل کی ہیں۔[۱]

ابو یہ کا ماننا ہے کہ اس نے ابوہریرہ کی تربیت کی تاکہ اس کی خرافات اور منقولات کو دین اسلام میں داخل کرے یہاں تک کہ وہ کعب الاحبارر کی باتوں کو حدیث مرفوع کے عنوان سے نقل کرتا تھا۔[۲]

ایک شخص نے امام محمد باقر سے عرض کیا کہ کعب الاحبار کہتا ہے کہ

،ان الکعبہ تسجد لبیت المقدس فی کل غدا، خانہ کعبہ ہر صبح بیت المقدس کو سجدہ کرتا ہے۔

امام نے فرمایا تم اور کعب الاحبار دونوں جھوٹے ہیں ۔نیز فرمایا خداوندعالم نے خانہ کعبہ سے زیادہ محبوب زمین پر کسی بقع کو خلق نہیں کیا۔[۳]

عبداللہ بن سلام

اس کا نام حصین بن سلام بن الحارث الاسرائیلی تھا۔وہ یہودی دانوں دانشوروں میں سے تھا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ میں داخل ہونے کے آغاز یا آپ کی وفات سے دو سال پہلے مسلمان ہوا اور سن ۴۳ھ ق میں وفات پائی۔وہ لوگوں کو جذب کرنے کے لئے توریت سے احادیث نقل کرتا تھا خاص طور سے اس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے صفات کے سلسلے میں بہت زیادہ مطالب نقل کیے ہیں۔[۴]

۱۔الاصابہ ج ۳ ص۱۱۶

۲۔اضواء علی السنة المحمدیہ التفسیر والمفسرون فی ثوبہ القشیب ص۱۶۴ج۲ص۱۰۲

۳۔کلینی کافی ج ۴ ص۲۳۹۔ بحار الانوار ج۴۶ص۳۵۴

۴۔سیر اعلام النبلاء ج۲ ص۴۱۸۔ ۴۱۹۔ الاصابہ ج۲ص۳۲۱

تمیم بن اوس الداری

ابو رقیہ ۔ تمیم بن اوس بن حارثہ او خارجہ الداری وہ ایک عیسائی راہب اور عبادت گزار شخص تھا جو کہ نویں ھجری میں مسلمان ہوا ۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے مسجد میں قصہ بیان کرنے کی بنیاد رکھی ۔ اس لیے عمر سے اجازت لی اور عمر نے اس کو اجازت دی لیکن امام علی علیہ السلام نے قصہ کہنے والوں کو مسجد سے نکال دیا ۔[1]

قصہ الجباسہ ۔ اسی سے نقل ہوا ہے اس نے دعوی کیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں داستانوں کو مجھ سے سیکھا اور منبر پر بیان کیا لیکن ان روایات کی سند ضعیف ہے ۔

وہب بن منبہ

وہ خراسان سے ہرات کا رہنے والا تھا جسے ایران کے بادشاہ نے یمن ملک بدر کردیا وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمان ہوا اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے پیغمبروں کی بہتر کتابوں کو پڑھا ہے اس کی طرف بہت سے قصوں اور بہت زیادہ اسرائیلیات کی نسبت دی گئی ہے۔

محمد بن کعب القرضی

وہ یہودی اور مسجد میں قصہ کہنے والوں میں سے تھا جو داستانوں کو قدیمی کتابوں سے نقل کرتا تھا

۱۔التفسیر والمفسرون فی ثوبہ القشیب ج ۲ ص ۱۰۲

عبداللہ بن عمرو بن العاص

وہ ہجرت سے سات سال پہلے پیدا ہوا اور سن ٦٥ ھ ق میں دنیا سے وفات پائی اور آٹھ ہجری سے پہلے مسلمان ہوا وہ یہودیوں کی کتابوں سے حدیث نقل کرتا تھا وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث نقل کرنے کے باوجود اس کام کو جائز سمجھتا تھا۔[1]

ابوہریرہ

اس کا نام نسب مشخص نہیں ہے۔ وہ تیس سال کی عمر میں ہجرت کے ساتویں سال پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بہت کم رہنے کے باوجود اس سے بہت زیادہ احادیث نقل ہوئی ہیں وہ کعب الاحبار کا شاگرد تھا اور اس کی احادیث کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مرفوع حدیث کے عنوان سے نقل کرتا تھا۔

ابن جریج

عبد الملک بن عبد العزیز بن جریج وہ در واقع رومی اور عیسائی تھا۔وہ تابعین کے دور میں اسرائیلیات کو نقل کرنے کا سرچشمہ تھا اس کی بہت سی احادیث کو طبری نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔

تفسیر میں اسرائیلیات کے ممنوع ہونے کے دلائل

الف : عقلی دلیل

توریت اور انجیل دو آسمانی کتابیں تھیں جن کی اصل کی قرآن نے تائید کی ہے طول تاریخ میں یہ کتابیں تحریف کی زد میں آ گئیں اور بعض غیر واقعی اور اہم مطالب میں داخل ہوگئے اس مطلب کی طرف قرآن کی اشارہ کیا ہے اور تاریخی شواہد اور خود کتاب مقدس کا متن اس کا گواہ ہے اس طرح

۱۔ حدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج صحیح بخاری ج۴ ص۲۰۷

سے کہ بعض معاصر دانشوروں کے اعتراف کے مطابق توریت کا بعض حصہ حضرت موسی کی وفات کی ۸۰۰سال بعد لکھا گیا ہے من جملہ حضرت موسی کا انتقال اور ان کے دفن کا واقعہ بھی توریت میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ رہبران الہی کے سلسلے میں بعض خرافی اور نامناسب مطالب بھی توریت میں ذکر ہوئے ہیں۔[1]

انجیل بھی ایک سیرت کی کتاب ہے جس میں حضرت عیسی کی سرگزشت کو ولادت سے معراج تک بیان کیا گیا ہے اور فقط اس کا ایک جملہ ایسا ہے جو وحی ہو سکتا ہے[2]۔لہذا اگر کوئی چاہتا ہے کہ قرآن جیسے معجزہ اور الہی کتاب کی تفسیر اور اس کے معنی کو بیان کریں اور راہ سعادت و کمال کو طے کرے تو کیا وہ تو انجیل کے تحریر شدہ مطالب سے استفادہ کرے گا۔

واضح طور پر انسان کی عقل اس مطلب کو قبول نہیں کرتی کیونکہ یہ شیوا اور ماخذ ہم کو علمی حقائق تک نہیں پہنچاتے بلکہ ممکن ہے ہدایت کے راستے سے منحرف کرکے گمراہی میں دھکیل دیں۔

قرآنی دلیل

قرآن کریم بعض جگہ پر مشرکین سے خطاب کرتا ہے کہ اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کے مطالب کے سلسلے میں شک ہے تو اہل کتاب کی طرف مراجعہ کرے اور ان سے سوال کریں لیکن یہ مطلب مشرکین سے مخصوص تھا ایک مدت کے بعد قرآن کریم نے اسلام کے مخالفین کے ساتھ ثقافتی تبادلہ خیال کی طرف متوجہ کیا اور اعلان کیا کہ وہ لوگ تمہارے بارے میں کسی بھی طرح کی تباہی اور ثقافتی تہذیب میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے لہذا دشمنوں خاص طور سے مشرقوں اور اہل کتاب کے ساتھ دوستی نہ کرو۔

۱۔سفر پیدائش باب۱۹
۲۔انجیل متی باب سوم نمبر۱۷

ترجمہ۔ ایمان والو خبردار غیروں کو اپنا رازدار نہ بنانا یہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کوتاہی نہ کریں گے یہ سب تمہاری مشقت و مصیبت کے خواہشمند ہیں ان کی عداوت زبان سے بھی ظاہر اور دل میں چھپا رکھا ہے وہ تو بہت زیادہ ہے ہم نے تمہارے لئے نشانیوں کو واضح کرکے بیان کردیا ہے اگر تم صاحبان عقل ہو

سورۃ آل عمران آیت نمبر۱۱۸

اس لیے بعض صاحبان نظر نے اس آیت کو اہل کتاب کی طرف رجوع کرنے کے سلسلے میں نہی صریح مانا ہے۔

ج: روائی دلیل

پیغمبر اسلام سے منقول بعض احادیث سے استفادہ ھوتا ھے کہ آپ نے مسلمانوں کو تورات و انجیل کے مطالب کو اسلامی تہذیب میں داخل کرنے سے منع کیا ہے یہاں تک کہ بعض موارد میں ان سے سوال کرنے کو بھی منع کیا ہے۔ایک حدیث جابر بن عبداللہ انصاری سے نقل ہوئی ہے کہ
ان عمز بن خطاب اتی النبی) ص (فقال انا نسمع احادیث من یھود تعجبنا۔ افتری ان نکتب بعضھا؟ فقال ص " امتھوکون کما تھوکت الیھود والنصاری؟ لقدجءتکم بیضاء نقیہ ولو کان موسی حیا لماوسعہ الا اتباعی"
عقلی ۔قرآنی اور روای دلائل کو مدنظر رکھتے ہوئے اہل کتاب کی طرف رجوع اور صحابہ کرام سے منقول اقوال کو قبول کرنے کی کوئی گنجائش نہیں بچتی ۔

اہل کتاب کی طرف رجوع کرنے کے طریقے

تفسیر قرآن میں استفادہ کرنے کے لئے اہل کتاب کی طرف مراجعہ کرنے کے مختلف طریقے ہیں اور ہرایک کا خاص حکم ہے۔

تفسیر قرآن کے ماخذ کے عنوان سے اہل کتاب سے سوال کرنا

چونکہ توریت اور انجیل تحریف شدہ ہیں ۔اور ان میں بعض غیر واقعی اور خرافی مطالب وارد ہوئے ہیں اس وجہ سے آسے تفسیر قرآن کا معتبر ماخذ قرار نہیں دیا جاسکتا ۔لہٰذا آیات قرآن کی تفسیر کے سلسلے میں شارحین توریت و انجیل یعنی یہود و میسیحیت کے دانشوروں سے سوال نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ بھی غیر محترم پر اور تحریف شدہ مصادر سے جواب دیں گے۔جس کے نتیجے میں اسرائیلیات تفسیر میں وارد ہو جائیں گی اسی وجہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں اہل کتاب سے سوال کرنے کو منع کیا گیا ہے ۔

ب توریت و انجیل کے مطالب کو اسلامی حدیث اور تفسیر قرآن کے عنوان سے نقل کر نا

یہ مورد اسرائیلیات کو نقل کرنے کی سب سے زیادہ واضح قسم ہے اور کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے ۔

توریت و انجیل کے مطالب کو تفسیر میں غیر مصدر کے ذکر کرنا

یہ شیوہ بھی تفسیر میں اسرائیلیات کے وارد کرنے پر ختم ہوگا۔اس لئے اس کا شمار اسرائیلیات کے مصادیق میں سے ہوتا ہے جو ممنوع ہے ۔

*د توریت و انجیل کے باطل مطالب کے سلسلے میں تنقید و تحقیق اور قرآن کریم کی حقانیت کو بیان کرنے کے لیے ان کے مستند مطالب کو ذکر کرنا

ہر قرآنی محقق کے لئے ضروری ہے کہ قرآن کریم کی بعض آیات کی تفسیر کرتے وقت ان کا تورات و انجیل یہاں تک کہ دوسری آسمانی کتابوں سے مقایسہ کرے۔تاکہ قرآن کی حقانیت کو ثابت اور ان کے باطل ہونے کو آشکار کر سکے یا اسرائیلی احادیث کی شناخت کر کے ان کو رد کر سکے۔
یہ تحقیقی ضرورت ان موارد میں سے ایک ہے جو ایک محقق کے لئے ضروری اور جائز ہیں۔اور درواقع قاعدہ" تفسیر میں اسرائیلیات کے استعمال کا ممنوع ہونا "اس سلسلے میں استثنا ہے۔ کیونکہ مذکورہ قاعدہ کے ممنوع ہونے کا مقصد اسلامی تہذیب میں اسرائیلیات کے وارد ہونے اور بعض مطالب کو حقیقی مطالب سے مخلوط ہونے سے روکنا ہے۔جبکہ یہ قسم اسلامی ثقافت میں اسرائیلیات اور باطل مطالب کے وارد ہونے پر ختم نہیں ہوتی۔بلکہ اس کا نتیجہ اسلامی تہذیب کو اسرائیلیات سے الگ کرنا اور قرآن کریم کی حقانیت کو ثابت کرنا ہے۔

اسرائیلیات کے جائز ہونے کی شرائط

قرآن کریم کے ساتھ مقایسہ اور اس کی حقانیت کو ثابت کرنے کے مقصد سے تورات و انجیل وغیرہ کی طرف رجوع کرنا جیسا کہ اس آیت میں ہے ا
ترجمہ "اور ہم نے ذکر کے بعد زبور میں بھی لکھ دیا ہے کہ ہماری نبی زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہی ہوں گے "
سورہ انبیاء آیت نمبر۱۰۵
زبور کتاب میں جو کتاب مقدس کی عہد عتیق میں واقع ہوئی ہے اسی کے مشابہ مطلب ذکر ہوا ہے۔
شریر نسل منقطع ہوجائے گی اور صالحین زمین کے وارث ہوں گے اور ہمیشہ اس پر زندگی بسر کریں گے۔[1]

۱۔کتاب مقدس عہد عتیق زبور داؤد مرموز ۲۷ نمبر۲۹۔ ایضا نمبر۹۔۱۰۔۱۱۔۱۷۔۱۸

یہ مطلب قرآن کے دعوے کو ثابت کرتا ہے کیونکہ یہ مطلب پہلے زبور میں آیا ہے اسی لئے بعض مفسرین نے اپنی تفاسیر میں زبور داؤد کے اس مطلب کو ذکر کیا ہے ۔

۲ *قرآن کریم کے ساتھ مقایسہ اور ان کے خرافات کو باطل قرار دینے کے مقصد سے تحریف شدہ کتابوں کی طرف مراجعہ کرنا

جیسے توریت اور قرآن کریم میں جناب لوط اور ان کے خانوادہ کی طہارت کامقایسہ ان موارد میں سے ایک ہے ۔

قرآن میں آیا ہے

ترجمہ یہ لوگ بہت پاکباز بن رہے ہیں

سورہ الاعراف آیت نمبر ۸۲ سورہ نمل آیت نمبر۵۶۔

لوط صوغر سے باہر نکلے اور پہاڑ میں سکونت اختیار کی۔ کیونکہ وہ ڈر گئے کہیں صوغر ہی میں نہ رہ جائیں اس لیے اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ غار میں رہنے لگے ۔بڑی بیٹی نے چھوٹی بیٹی سے کہا ہمارے والد بوڑھے ہو گئے ہیں۔اور روئے زمین پر کوئی شخص نہیں ہے جو ہم سے ازدواج کرے۔ او چلو اپنے باپ کو شراب پہ پلاتے ہیں اور ان کے ساتھ ہمبستری کرتے ہیں تاکہ اپنے باپ کی نسل کو بچا سکے لہٰذا اسی رات دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہو جاتی ہیں ۔لوط کے خانوادہ کے ساتھ قرآن کریم اور توریت) تحریف شدہ (کے دوگانہ رویے سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن پیغمبروں کی عظمت اور طہارت کی کتنی زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ تورات و انجیل کے مطالب کو مذکورہ شکل میں نقل کرنا نہ صرف وقت نقصان دہ اور ممنوع نہیں ہے بلکہ قرآن اور ادیان الہی کی خدمت ہے ۔

اسرائیلیات کو پہچاننے اور ان سے بچنے کا معیار

وہ احادیث جو یہودیوں اور عیسائیوں کے توسط سے اسلامی ثقافت میں داخل ہوئی ہیں ان کو دو طرح سے پہچانا جا سکتا ہے۔

ا۔سند کے ذریعہ

تفسیری احادیث کی سند کے سلسلے میں تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں اسرائیلیات کے راوی ہیں یا نہیں۔

اس صورت میں اگر سلسلہ سند میں کعب احبار جیسے افراد ہو تو اس روایت کے اسرائیلی ہونے کا زیادہ احتمال ہے اور کم از کم وہ روایت استناد کے قابل نہیں ہوں گی۔جیسے کعب الاحبار سے وہ روایات جو سورہ کہف کی آیات کے ذیل میں تفاسیر اور تاریخی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں اور اس کے علاوہ شام اور بیت المقدس کی فضیلت میں غلو آمیز روایات جو کعب الاحبار۔ وہب بن منبہ اور ابوہریرہ سے نقل ہوئی ہیں۔[1]

ب متن کے ذریعہ

امبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت علیہم السلام کی احادیث الہی مطالب ہیں جن کا سرچشمہ وحی الہی ہے اس لئے ان میں عقل۔یقینی علم محکم آیات۔ سنت قطعیہ یقینی تاریخی منقولات کے مخالف مطالب نہیں پائے جاتے۔لہذا اگر کوئی حدیث مذکورہ پانچ مطالب کے مخالف ہو اور یہودیوں اور

ا۔کتاب مقدس سفر پیدائش باب اول نمبر۲۸ ۲۷

عیسائیوں کے مصادر جیسے تورات و انجیل اور ان کے ملحقات یا تلمود میں ہو تو وہ معتبر نہیں ہوگی ۔اور قوی احتمال کے ساتھ وہ اسرائیلیات میں سے ہے جسے اسلامی ثقافت میں داخل کیا گیا ہے۔

مثال ۔وہ روایات جس نے آسمانوں کی ترتیب کو یونان کی بطلیموسی قواعد کی بنیاد پر ذکر کیا گیا ہے اس میں چاند۔دنیاوی آسمان اور عطارد آسمان دوم پر ہے اور اسی طرح ساتویں آسمان تک کے اس سلسلہ کو بیان کیا گیا ہے اور یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ آسمان کوہ قاف پر ٹکا ہے۔ جو پوری زمین پر احاطہ کئے ہے اور زمین ایک گائے کے سینگ پر ہے جو ایک دریا میں موجود تسبیح کرنے والی مچھلی کی پیٹھ پر کھڑی ہے ۔[1]

یہ بات واضح ہے کہ یہ احادیث ہمارے زمانے میں علم فلکیات اور علم ارضیات کے قطعی مطالب کی مخالف ہیں اور قرآن کریم نے ہیت بطلیموسی کے خلاف زمین کو متحرک بتایا ہے اور سات آسمانوں سے مراد بھی افلاک بطلیموسی نہیں ہیں ۔

تفسیر میں اسرائیلیات کے نمونے

بعض مقامات اور موضوعات میں اسرائیلی احادیث کثرت کے ساتھ نقل ہوئی ہیں مثلا

حضرت آدم کی خلقت خدا کی صورت

ابو ہریرہ سے ذکر ہے کہ

آن اللہ خلق آدم علی صورتہ

سورہ نساء آیت نمبر ۱

۱۔اضواء علی السنۃ المحمدیۃ محمود ابوریۃ یہ ص۱٦۷۔ ۱٦۸۔ ۱۷۰

توریت میں ذکر ہے کہ " اس کے بعد خدا نے آدم کو اپنی صورت میں پیدا کیا ان کو خدا کی شکل میں پیدا کیا گیا[۱] "

سیوطی نے درمنثور اور طبری نے اپنی تفسیر میں کعب وغیرہ سے عجیب و غریب قصہ نقل کیے ہیں[۲] ۔جو آیات[۳] روایات کی رو سے ملائکہ کی عصمت اور دینی مطلب کے خلاف ہیں۔[۴]

حضرت آدم کے ذریعہ کعبہ کی تعمیر اور حجر اسود کے بہشتی یا قوت ہونے کے بارے میں اسرائیلیات[۵]

بنی اسرائیل کے تابوت کے بارے میں اسرائیلیات[۶]

جالوت کے قتل کے سلسلے میں اسرائیلیات۔[۷]

خلاصہ و تبصرہ

قرآن مجید کے علاوہ جتنی آسمانی کتابیں مختلف ادوار میں مختلف انبیاء پر نازل ہوتی رہی ہیں ان میں سے کوئی کتاب بھی اپنی اصل حالت میں موجود نہیں اور کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہکہ ان آسمانی کتابوں میں خرافی مطالب ۔ترامیم اور تحریفات موجود نہیں ۔ان آسمانی کتاب میں علمائے یہود و نصاریٰ

۱۔کتاب مقدس سفر پیدائش باب اول نمبر ۲۸ ۲۷

۲ ۔الاسرائیلیات و الموضوعات ص۱۵۹۔ ۳۰۵

۳ ۔سورۃ تحریم آیت نمبر۶

۴ ۔ تفسیر برہان ج۱ص۱۳۶۔ ۱۳۸

۵ ۔ تفسیر والمفسرون فی ثوبہ القشیب ج ۲ص۱۵۶۔ ۱۵۷۔ اسرائیلیات والموضوعۃ

۶ ۔ایضا

۷ ۔ایضا

نے کتنی خیانت کی ہیں کوئی بھی اب اسے علیحدہ نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ تورات کا بعض حصہ حضرت موسی کی وفات سے ۸۰۰ سال بعد لکھا گیا۔ قرآن مجید وہ واحد کتاب ہے جو اپنے نازل ہونے کے وقت سے اب تک تا روز قیامت کسی بھی قسم کی آمیزش کی۔ بیشی اور حذف و اضافہ سے محفوظ رہے گی ۔اسلامی اصطلاح میں جہاں ان روآیتوں کو لفظ اسرائیلیات سے منسوب کیا جاتا ہے جس کا سرچشمہ یہودیت ہے وہیں ان واقعات اور قصص پر بھی ان کا اطلاق ہونے لگا ہے جن کا اصل منبع یہودیت تو نہیں کہ ان روایات کو گھرنے)وضع (کرنے والے منافقین اور مشرکین بشمول نصاریٰ ہیں ۔یہودیوں کی اسلام دشمنی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ ظاہری اسلام کے لبادے میں اسلام کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے لگے اور یہودیانہ سماج میں پھیلی ہوئی انبیاء کے متعلق من گھڑت باتوں کو مسلمانوں کی مجالس میں بیان کرنے لگے تاکہ مسلمانوں کے صحیح و سالم عقائد میں شکوک و شبہات کے بیج بو دیے جائیں ۔

قرآن میں اصلاح و تربیت کے پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے اس واقعہ کا صرف وہ حصہ بیان کیا جاتا ہے جو موقع اور محل کے مناسب ہو پھر منتقل ہو جاتا ہے۔ان واقعات کی جزءیات جیسا کہ متعلقہ افراد کے نام علاقہ ملک و تاریخ وغیرہ سے بحث نہیں کرتا۔اسرائیلی روایات کی حقیقت کے اعتبار سے ایک پہلو تو یہ ہے کہ قرآن کی تصریحات کے مطابق تورات و انجیل میں تحریف ہو چکی ہے اور اسرائیلی روایات پر مشتمل لٹریچر بھی باوثوق ذرائع سے لوگوں تک نہیں پہنچ سکا اس لئے اس میں شامل واقعات کو من و عن قبول کرلینا علمی دیانت، حقیقت اور تحقیق کے تقاضوں کے موافقت نہیں رکھتا ۔مسلمان قرآن کے مجمل واقعات کی تفصیل ان لوگوں سے پوچھے تھے جو پہلے یہودیوں کے مشہور علماء تھے اور جو بعد میں ظہور اسلام کے بعد مسلمان ہو گئے تھے جیسے عبداللہ بن سلام۔ عبداللہ بن سوریہ کعب یہ لوگ تو رہ کے عالم تھے اور روایات اور جس سے وہ خوبی واقف تھے اور مسلمان ان کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے الاحبار۔ اسرائیلیات کی حدیثیں لٹریچر میں دخل اندازی میں قصہ گو واعظین منافقین کی سازشیں اور فرضی سندوں کا عنصر نمایاں ہے۔اسرائیلیات کی دخالت کو پہچاننے اور اس کے بچنے کے

طریقوں میں ہمیں ہمارے ائمہ علیہم السلام سے بہت زیادہ مدد ملتی ہےائمہ علیہم السلام کی احادیث کے ذریعہ ہمیں بہت آسانی سے پتہ چل جاتا ہے کہ کون سی احادیث جھوٹی ہیں ۔اسرائیلیات کو نقل کرنے والی اہم شخصیات کے حالات زندگی کو جاننے کے ذریعہ بھی ہم اسرائیلیات کو آسانی سے پہچان سکتے ہیں۔اس کے علاوہ اہل کتاب کی طرف رجوع کرنے کے طریقے بھی بتائے گئے ہیں ۔حدیث جو یہودی اور عیسائیوں کے توسط سے اسلامی ثقافت میں داخل ہوئی ہے ان کو دو طریقوں سے پہچانا جا سکتا ہے)
الف)(سند کے ذریعے)(ب)(متن کے ذریعے (
قرآن کی محکم آیات ،عقل یقینی علم، سنت قطعیہ اور یقینی تاریخی منقولات کی مخالفت عام معیار ہیں جو اسرائیلیات وغیرہ کو شامل ہوتے ہیں۔
اسلامی احادیث کی یہودیوں اور عیسائیوں کے مصادر کے مطالب سے مشابہت حدیث کے اسرائیلی ہونے کا معیار نہیں ہے اور نہ ہی حدیث کے اعتبار کو ثابت کرتا ہے ۲۔ کیونکہ بعض حقائق پر مبنی مطالب بھی اس طرح تورات و انجیل میں پائے جاتے ہیں جو قرآن میں آئے ہیں اور قرآن نے ان کی تائید کی ہے ۔تمام الہی کتابوں اور وہ صحیح احادیث کے مصدر کا ایک ہونا کہ جو وحی الہی ہے بعض مطالب کے مشابہ ہونے کی وجہ سے ہے ۔جیسے توحید و نبوت سے مربوط مطالب نے توریت کے دس احکام کا مضمون آیات قرآن میں بھی آیا ہے اس کے علاوہ پہاڑ پر موعظہ اور حضرت عیسیٰ کی نصیحتیں کہ جن کا مجموعہ احادیث تحف العقول میں آیا ہے۔

اس لئے اگر کوئی اسلامی معتبر حدیث کسی آیت کے سلسلے میں کسی مطلب کو بیان کرے جس کے مشابہ مطلب تورات اور انجیل میں بھی پایا جاتا ہو ایسی صورت میں حدیث اسرائیلیات میں شمار نہیں ہوگی بلکہ اگر کوءی ضعیف اور غیر معتبر حدیث یا کوئی ایسی حدیث جس کا مطلب مذکورہ پانچ معیار سے سازگار نہ ہو اور یہودیوں اور عیسائیوں کے مشابہ مطالب کو بیان کر رہی ہوں تو ان موارد میں قوی احتمال پایا جاتا ہے کہ ایسی حدیث اسرائیلیات میں سے ہوگی۔اگر محکم قراین ہو تو بعض اوقات علم

حاصل ہو جاتا ہے کہ مذکورہ حدیث اسرائیلیات میں سے ہے۔ ان روایات کی پہچان محدثین کرام اور ائمہ جرح و تعدیل کا کام ہے۔جو لوگ سند حدیث کے فن میں مہارت رکھتے ہیں وہی پہچان کر بتائیں گے کہ کون سے روایات اسرائیلیات میں سے ہیں۔عام عوام کے لئے روایات میں صرف صحیح روایات پہچاننا اتنا آسان نہیں ۔اس لیے عوام کو اس بارے میں اس فن کے ماہرین علم سے ھی پوچھنا چاہیے ۔بعض اوقات ایک ہی واقعہ کتب احادیث میں کسی صحابی سے بھی منقول ہوتا ہے لیکن پھر بھی وہ اسرائیلی روایت ہوتا ہے ۔اور بعض مرتبہ کسی واقعے کا کوئی جز یا کوئی حصہ اسرائیلی روایت ہوتا ہے۔جبکہ اسی واقعے کا کوئی حصہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی ہوتا ہے۔

مصادر

۱۔ محمد حسین ذہبی ۔التفسیر والمفسرون

۲۔طبری جامع البیان محمد بن جریر طبری

۳۔ابن ندیم الفہرست

۴۔ایازی المفسرون حیاتھم و منھجھم ۱۴۱۴ھ۔ ص ۳۶

۵۔ ایازی المفسرون حیاتہم و منہجہم ۱۴ ۱۴ ہجری صفحہ ۳۶

ذہبی التفسیر والمفسرون دار الکتب الحدیث جلد ا ص ۲۲

۶۔ شیخ طوسی التبیان فی تفسیر القرآن بیروت ج ۶ ۔ص۳۹۸ فخر رازی التفسیر الکبیر قاہرہ ج۳۰ ص ۵۷۔ طباطبائی المیزان فی تفسیر القرآن بیروت ج۱۲ ص۲۸۴۔

۷۔ایضا

۸۔ بخاری صحیح البخاری ۱۴۰۱ھ ج۵ص۲۰۸طبری جامع البیان ۱۳۳۰۔ ۱۳۲۲ھج۷ص۳۰

۹۔ ایضا

١٠۔ ذہبی الاسرائیلیات فی التفسیر و الحدیث ۔١۴٠۵ھ ص١٩
١١۔ معرفتۃ التفسیر والمفسرون فی ثوبہ القشیب ١۴١٩ھ ج٢ص٣١٢
١٢۔ ایضا ص٣٢٢
١٣۔ معرفتۃ التفسیر والمفسرون فی ثوبہ القشیب ١۴١٩ھ ج٢ص٣٢٢
١۴۔ ایضا ص ٣٢۵
١۵۔ ایضا ص٣٢٦
١٦اایضا ص ٣٢٧
١٧۔ ایضا ص ٣١٢ ٣١٣
١٨ ۔معرفت التفسیر والمفسرون فی ثوبہ القشیب ١۴١٩ھ ج ۴ص ٧٩
١٩۔ سورہ انبیاء آیت ٧ سورہ نحل آیت ۴٧
٢٠۔ التفسیر والمفسرون فی ثوبہ القشیب
٢١۔ تاریخ ابو زرعۃ الدمشقی ج ١ ص ۵۴۴۔ البدایہ و النہایہ ابن کثیر ج ٨ ص ١٠٨ ۔سیر اعلام النبلاء ج ٣ ص ۴۴٠
٢٢۔ تہذیب التہذیب ج ٨ص۴٣٩
٢٣۔ التفسیر والمفسرون فی ثوبہ القشیب ج٢ ٧٩ اضواء علی السنۃ المحمدیۃ ص١٨١
٢۴۔ فجر الاسلام ص١٦٠۔ ١٦١
٢۵۔ اضوا علی السنۃ المحمدیہ ص١٧٠۔ ١٨١۔
٢٦۔ الاصابہ ج ٣ ص١١٦
٢٧۔ اضواء علی السنۃ المحمدیہ التفسیر والمفسرون فی ثوبہ القشیب ص١٦۴ج٢ص١٠٢
٢٩۔ کلینی کافی ج ۴ ص٢٣٩۔ بحار الانوار ج۴٦ص٣۵۴

۲۸۔ سیر اعلام النبلاء ج۲ ص۴۱۸۔ ۴۱۹۔ الاصابہ ج۲ص۳۲۱

۳۰۔ التفسیر والمفسرون فی ثوبہ القشیب ج ۲ ص۱۰۲

۳۱۔ حدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج صحیح بخاری ج۴ ص۲۰۷

۳۲۔ سفر پیدائش باب ۱۹

۳۳۔ انجیل متی باب سوم نمبر ۱۷

۳۴۔ کتاب مقدس عہد عتیق زبور داؤد مرموز ۲۷ نمبر۲۹۔ ایضا نمبر۹ ۔۱۰ ۔۱۱ ۔۱۷ ۔۱۸

۳۵۔ اضواء علی السنۃ المحمدیۃ محمود ابوریۃ یہ ص۱٦۷۔ ۱٦۸۔ ۱۷۰

۳٦۔ کتاب مقدس سفر پیدائش باب اول نمبر۲۸ ۲۷

۳۷۔ الاسرائیلیات و الموضوعات ص۱۵۹۔ ۳۰۵

۳۸۔ سورۃ تحریم آیت نمبر ٦

۳۹۔ تفسیر برہان ج۱ص۱۳٦۔ ۱۳۸

۴۰۔ تفسیر والمفسرون فی ثوبہ القشیب ج ۲ص۱۵٦۔ ۱۵۷۔ اسرائیلیات والموضوعۃ

۴۱۔ ایضا

امامت؛ قرآن کی روشنی میں

استاد شہید مرتضیٰ مطہری

ترجمہ: سید احتشام عباس زیدی[1]

نظر ثانی: عون علی جاڑوی[2]

آیت کریمہ "الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا"[3] کے سلسلہ میں عرض ہے کہ خود آیت کے اندر موجود قرائن اور ان کے علاوہ اس سے متعلق دوسرے آثار و شواہد، یعنی آیت کی شان نزول کے تحت شیعہ و سنی ذرائع سے وارد ہونے والی روایات بھی یہ ظاہر کرتی ہیں کہ مذکورہ آیت واقعہ غدیر خم سے تعلق رکھتی ہے۔

چونکہ اس موضوع کے ذیل میں قرآن کی آیتیں ہماری بحث کا محور ہیں یعنی وہ آیتیں جن سے شیعہ اس باب میں استدلال کرتے ہیں، لہٰذا ہم مزید دو تین آیتیں جنہیں علماء شیعہ استدلال میں پیش کرتے ہیں یہاں ذکر کر رہے ہیں تاکہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ استدلال کا طریقہ کیا ہے؟

ان آیات میں سے ایک اسی سورہ مائدہ کی آیت ہے جو مذکورہ بالا آیت سے تقریباً ساٹھ آیتوں کے بعد ذکر ہوئی ہے اور وہ یہ ہے: ''یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک و ان لم تفعل فما بلغت رسالتہ و اللہ یعصمک من الناس''[4] اے پیغمبر! جو کچھ آپ کے پروردگار کی جانب سے آپ پر نازل ہوا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دیجئے اور اگر آپ نے یہ نہ کیا تو رسالت کی تبلیغ نہیں کی اور اپنا فریضہ ادا نہیں کیا، خدا آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

---

[1] - درس خارج، حوزہ علمیہ قم

[2] - کورس منیجر، المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی قم

[3] - سورہ مائدہ آیت نمبر ۳

[4] - سورہ مائدہ آیت ۶۷

گفتگو آگے بڑھانے سے پہلے مقدمہ کے طور پر کچھ باتیں ذکر کرنا ضروری ہیں تاکہ اس آیت کے مفاد کی وضاحت ہو جائے نیز یہ مقدمہ گذشتہ آیت کے تحت بیان کے گئے مطالب کے لئے بھی معاون و مددگار ثابت ہوگا۔

اہل بیتؑ سے متعلق آیات کا خاص انداز

یہ بات واقعا اسرار الٰہی کی حیثیت رکھتی ہے کہ مجموعی طور پر قرآن میں اہل بیتؑ سے متعلق آیتیں اور خصوصا وہ آیات جو کم از کم ہم شیعوں کے نقطہ نظر سے امیر المؤمنین (علیہ السلام) کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، ایک خاص وضع و کیفیت کی حامل ہیں جو خود ان آیات کے اندر نظر آتی ہے کہ اس تعلق اور فضیلت کو دوسرے مطالب کے درمیان یا دوسری باتوں کے ضمن میں بیان کرتے ہوئے گزر جایا جائے۔ اس پہلو کو جناب محمد تقی شریعتی نے اپنی کتاب "ولایت و خلافت" کی ابتدائی بحثوں میں نسبتا اچھے انداز سے بیان کیا ہے اگرچہ دوسروں نے بھی اس نکتہ کو بیان کیا ہے لیکن فارسی میں شاید پہلی بار انہوں نے ہی اس کا ذکر فرمایا ہے۔ آخر اس کا راز کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ان لوگوں کا جواب بھی ہو جائے گا جو یہ کہتے ہیں کہ اگر خدا چاہتا تھا کہ علی (ع)، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین ہوں تو پھر قرآن میں صاف صاف ان کے نام کا ذکر کیوں نہیں ہے۔

آیت تطہیر

مثال کے طور پر آیت تطہیر کو ملاحظہ فرمائیے "انما یرید الله لیذہب عنکم الرجس اهل البیت و یطہرکم تطہیرا"[۱] اس آیت کے بارے میں دریافت کیا جائے تو ہم کہیں گے کہ اس کا مفہوم و مطلب بالکل واضح ہے۔ اللہ نے یہ ارادہ کیا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ اہل بیتؑ تم سے کثافتوں کو دور کرے، تمہیں پاک و پاکیزہ رکھے، و یطہرکم تطہیرا اور تمہیں مخصوص نوعیت اور خاص انداز میں تطہیر و پاکیزہ رکھے یا کرے۔ ظاہر ہے کہ جس تطہیر کا ذکر خدا کر رہا ہے وہ عرفی یا طبّی تطہیر نہیں ہے کہ یہ کہا جائے کہ خدا تم سے بیماریوں کو دور کرنا چاہتا ہے یا (معاذاللہ) تمہارے بدن کے امراض کے جراثیم کو زائل کر رہا ہے۔ ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ یہ تطہیر کے مصداق نہیں ہے، لیکن مسلم طور پر جس تطہیر کو خدا اس آیت میں بیان فرما رہا ہے اس سے مراد پہلی

۱۔ احزاب، آیت ۳۳

منزل میں وہ تمام چیزیں ہیں جنہیں خود قرآن ”رجس“ کا نام دیتا ہے۔ قرآن کے بیان کردہ ”رجس“ و ”رجز“ وغیرہ یعنی وہ تمام چیزیں جن سے قرآن منع کرتا اور روکتا ہے اور جنہیں گناہ شمار کیا جاتا ہے چاہے وہ اعتقادی گناہ ہو، اخلاقی گناہ ہو یا عملی گناہ۔ یہ سب رجس وکثافت ہیں اسی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ اس آیت سے مراد عصمت اہل بیتؑ ہے یعنی ان کا ہر طرح کی کثافت اور آلودگیوں سے پاک و پاکیزہ ہونا۔

فرض کیجئے کہ ہم نہ شیعہ ہیں نہ سنی، بلکہ ایک عیسائی مستشرق ہیں، عیسائی دنیا سے نکل کر آئے ہیں اور یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی کتاب (قرآن) کیا کہنا چاہتی ہے ہماری نظر قرآن کے اس جملہ پر پڑتی ہے پھر ہم اس سے متعلق مسلمانوں کی تاریخ اور سنن واحادیث کا جائزہ لیتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ نہ صرف وہ فرقہ جسے شیعہ کہتے ہیں اور جو اہل بیتؑ کا طرفدار ہے بلکہ وہ فرقے بھی جو اہل بیتؑ کے کوئی طرفدار نہیں ہیں اپنی معتبر ترین کتابوں میں جب اس آیت کی شان نزول بیان کرتے ہیں تو اسے اہل بیتؑ پیغمبر کی فضیلت قرار دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جس واقعہ کے تحت یہ آیت نازل ہوئی اس میں حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ، حضرت حسنؑ، حضرت حسینؑ اور خود حضرت رسول اکرمؐ موجود تھے اور اہل سنت کی احادیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو زوجۂ رسول اکرمؐ ام سلمہ [1] آنحضرتؐ کی خدمت میں آئیں اور عرض کی یا رسول اللہؐ اہل بیتؑ میں میرا بھی شمار ہے یا نہیں؟ آپؐ نے فرمایا تم خیر پر ہو لیکن اس میں شامل نہیں ہو۔ عرض کرچکا ہوں کہ اہل سنت کی روایات میں اس واقعہ کے حوالے ایک دو نہیں بلکہ بہت زیادہ ہیں۔

یہی آیت ہمیں اپنے مفہوم سے مختلف دوسری آیات کے درمیان نظر آتی ہے۔ اس سے قبل و بعد کی آیتیں ازواج پیغمبرؐ سے متعلق ہیں۔ اس سے پہلے کی آیت یہ ہے ”یا نساء النبی لستن کاحد من النساء“ [2] اسے ازواج پیغمبرؐ تم دوسری عورتوں جیسی نہیں ہو تم میں اور دوسری عورتوں میں فرق ہے، (یقیناً قرآن یہ نہیں کہنا چاہتا کہ تم دوسروں پر امتیاز رکھتی ہو) تمہارا گناہ دگنا اور دوہرا ہے کیونکہ اگر تم گناہ کروگی تو ایک گناہ تو یہ ہے

۱۔ یہ معظّمہ شیعوں کے نزدیک بہت محترم ہیں، اور خدیجہؑ کے بعد پیغمبر اکرمؐ کے سب سے زیادہ جلیل المرتبت زوجہ ہیں، اہل سنت کے یہاں بھی بہت محترم ہیں ان کی نگاہ میں خدیجہ و عائشہ کے بعد ام سلمہ ہی معظم و محترم خاتون ہیں۔

۲۔ سورہ احزاب، یت ۳۲

کہ تم نے وہ عمل بد انجام دیا اور دوسرے یہ کہ اپنے شوہر کی رسوائی کی مرتکب ہوئی۔ اس طرح دوگناہ تم سے سرزد ہوئے۔ یوں ہی تمہارے نیک اعمال بھی دوہرا اجر رکھتے ہیں کیونکہ تمہارا ہر عمل خیر دو عمل کے برابر ہے۔ بالکل یوں ہی جیسے کہا جاتا ہے کہ سادات کرام کے کار خیر کا ثواب اور برے عمل کا گناہ دوہرا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسروں کے مقابلہ میں ان کا ایک گناہ سنگین ہو جاتا ہے اور فرق رکھتا ہے۔ بلکہ ان کا ایک گناہ دوگناہ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک سید (معاذاللہ) شراب پیئے تو وہ شراب پینے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے عمل کا بھی مرتکب ہوا ہے اور وہ یہ کہ چونکہ وہ پیغمبرؐ اور آل پیغمبرؐ سے منسوب ہے لہٰذا اپنی شراب نوشی کے ذریعہ پیغمبر ﷺ کی ہتک و رسوائی کا مرتکب بھی ہوا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ دیکھے کہ پیغمبرؐ کی اولاد اس قدر کھلم کھلا ان کے حکم کے خلاف عمل کر رہی ہے اس کی روح پر بڑا گہرا اثر ہوگا۔

ان آیات میں تمام ضمیریں مؤنث کی استعمال ہوئی ہیں "لستن کاحد من النساء ان اتقين" صاف ظاہر ہے کہ اس سے مراد ازواج پیغمبر اکرم ﷺ ہیں۔ دو تین فقروں کے بعد یک بیک ضمیر مذکر ہو جاتی ہے اور ہم اس آیت کی تلاوت کرتے ہیں، "انما يريد الله ليذهب عنكم (عنکن نہیں ہے) الرجس اہل البيت و يطهركم تطهيرا" اس کے بعد دوبارہ مؤنث کی ضمیریں استعمال ہونے لگتی ہیں قرآن کا کوئی لفظ عبث اور غلب نہیں ہے۔ اولا یہاں کلمہ اہل البیت استعمال ہوا ہے، اور اس کے پہلے ازواج رسول کا تذکرہ ہے "يا نساء النبی" یعنی نساء النبی کا عنوان اہل البیت میں تبدیل ہو گیا اور دوسرے مؤنث کی ضمیر مذکر میں تبدیل ہو گئی یہ سب لغو اور عبث نہیں ہے، ضرور کوئی دوسری چیز ہے۔ یعنی قرآن گذشتہ آیات سے الگ کوئی دوسری بات کہنا چاہتا ہے، آیت تطہیر سے قبل و بعد کی آیتوں میں ازواج پیغمبر اکرم ﷺ کے لئے حکم، دھمکی اور خوف و رجاء کا انداز پایا جاتا ہے: "و قرن فی بیوتكن ولاتبرجن تبرج الجاهلیہ" اپنے گھروں میں رہو اور زمانۂ جاہلیت کے مانند اپنے بناؤ سنگھار کو دکھائی نہ پھرو۔ گویا ایک کے بعد ایک حکم اور تہدید و دھمکی ہے، ساتھ ہی خوف و رجاء بھی ہے کہ اگر نیک اعمال بجالاؤگی تو ایسا ہوگا اور اگر برے اعمال کروگی تو ویسا ہوگا۔

یہ آیت (آیت تطہیر) مدح سے بالاتر ہے ایک بات ہے قرآن میں اہل بیتؑ کی گناہ و معصیت سے پاکیزگی اور طہارت کے مسئلہ کو بیان کرنا چاہتا ہے، اس آیت کا مفہوم اس سے پہلے اور بعد کی آیتوں سے مفہوم و مطلب

سے ایکدم الگ ہے۔ یہاں اہل بیتؑ سے خطاب ہو رہا ہے اور وہاں ازواج رسولؐ سے، یہاں مذکر کی ضمیر ہے اور وہاں مؤنث کی، لیکن یہی آیت تطہیر جس کا مفہوم و مطلب پہلے اور بعد کی آیتوں سے اس قدر مختلف ہے، ان آیات کے درمیان میں قرار دی گئی ہے۔ اس کی مثال اس شخص کے مانند ہے جو اپنی گفتگو کے دوران الگ سے ایک بات کہہ کر گفتگو کے سلسلہ کو پھر جوڑ دیتا ہے، اور اپنی بات جاری رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ ائمہ علیہم السلام کی روایات میں بڑی تاکید سے یہ بات کہی گئی ہے کہ ممکن ہے قرآنی آیات کی ابتدا میں کوئی ایک مطلب بیان ہوا ہو، درمیان میں کوئی دوسرا مطلب اور آخر میں کوئی تیسری بات کہی گئی ہو۔ اور قرآن کی تفسیر کے مسئلہ کو ان حضرات نے جو اتنی اہمیت دی ہے اس کا سبب بھی یہی ہے۔

یہ بات صرف ہماری روایات اور ائمہ کے ارشادات میں ہی نہیں پائی جاتی بلکہ اہل سنت حضرات نے بھی ان تمام مطالب کو نقل کیا ہے کہ "انما یرید اللہ لیذہب عنکم الرجس۔۔۔" اپنے پہلے اور بعد کی آیتوں سے فرق رکھتی ہے۔ اس آیت کا مضمون اور اس کے مخاطب بھی الگ ہیں۔ یہ آہت ان ہی لوگوں سے متعلق ہے جو اس

دوسرا نمونہ

آیت اکملتو لکم دینکم میں بھی یہی بات نظر آتی ہے بلکہ یہاں مذکورہ بالا آیت تطہیر سے زیادہ عجیب انداز نظر آتا ہے اس سے پہلے کی آیت میں بہت ہی سادے اور معمولی مسائل ذکر کیے گئے ہیں ہیں

جو پاؤں کا گوشت تمہارے لئے حلال ہے ہے ان کا تزکیہ یوں کرو اور اگر مردار ہو تو حرام ہے ہے وہ جانور جنہیں تم دم گھونٹ کر مار ڈالتے ہو ہو حرام ہیں ہیں اور وہ جانور جو ایک دوسرے کے سینگ مارنے سے مر جاتے ہیں ان کا گوشت حرام ہے ہے پھر پھر ایک ارشاد ہوتا ہے

اس کے بعد دوبارہ مسائل کا ذکر شروع ہو جاتا ہے جو پہلے بیان ہو رہے تھے مذکورہ آیت کے یہ جملے آپ نے پہلے اور بعد کی آیتوں سے سرے سے مل نہیں کھاتا عطا یا نئی یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے یہ وہ بات ہے جو دوسرے مطالب کے درمیان الگ سے سرسری طور پر پر بیان کر دی گئی ہے ہے اور پھر اسے ذکر کے آگے آگے بڑھ گئے ہیں ہیں۔ اس وقت اس وقت ہم جس آیت کا ذکر کرنا چاہتے ہیں آیت تبلیغ کا بھی یہی حال ہے یعنی وہ

بھی ایسی آیت ہے ہے کہ اگر ہم اسے اس سے پہلے اور بعد کی آیات سے نکال دیں تو بھی ان کا ربط نہیں بن سکتا ۔اس کی جگہ سے ہٹادیں تو اس سے پہلے اور اس کے بعد کی آیتوں میں میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا یوں ہی زیر بحث آیت میں دوسری آیات بھارت کے درمیان ایک ایسی آیت ہے کہ نہ اس سے ما قبل کی آیتوں سے متعلق کہا جاسکتا ہے اور نہ ہی بعد کی آیتوں کا مقدمہ بلکہ اس میں ایک دم الگ سے بات کہی گئی ہے ہے یہاں بھی خود آیت میں موجود قرائن اور اور شیعہ و سنی روایات اسی مطلب کی حکایت کرتی نظر آتی ہیں ہیں لیکن اس آیت کو بھی قرآن نے ایسے مطالب کے درمیان رکھا ہے جو اس سے کا بھی واسطہ نہیں کوئی ضرور کوئی راز ہوگا۔اس کا راز کیا ہے؟

اس مسئلے کا راز س اس میں جو راس پوشیدہ ہیں ہیں خود قرآن کی آیت کے اشارے کے بھی ظاہر ہے اور اور ہمارے ائمہ کی روایت بھی اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے ہے اور وہ یہ کہ اسلام کے تمام احکام و دستورات میں پیغمبر کا مسئلہ امیر المومنین کی امامت اور خاندان پیغمبر کی خصوصیت کی ایسا مسئلہ اور ایسا حکم تھا بستی سے کم عمل ہو سکا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ بچوں کی اہل عرب اپنی روح کی گہرائیوں میں تعصّبات رکھتے تھے جس کے سبب ان میں اس مطلب کے قبول کرنے پر اور اس پر عمل پیرا ہونے کی آمادگی بہت ہی کم نظر آتی ہے ہے اگر سے پیغمبر ہے خدمت میں میں امیر المومنین حکم پہنچتے تھے لیکن حضرت ہمیشہ اس تردید میں رہتے تھے کی اگر میں میں حکم بیان کر دوں تو وہ منافقین جن کا ذکر قرآن برابر کرتا رہا ہے کہنے لگیں گے کی دیکھو پیغمبر اکرم کنبہ نوازی سے کام لے رہے ہیں، جب کی پوری زندگی پیغمبر اکرم کا یہ شیوہ رہا کسی مسئلے میں اپنے لئے کسی خصوصیت کے قائل نہ ہوئے۔ ایک تو آپ کا اخلاق ایسا تھا دوسرے اسلام کا حکم ہونے کی بناپر بھی آپ اس بات سے غیر معمولی طور پر گریز کرتے تھے کہ اپنے اور دوسروں کے درمیان کوئی وئی امتیاز برتیں اور یہی پہلو پیغمبر اسلام کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب تھا۔

یہ مسئلہ یعنی اس حکم کی تبلیغ ہے کہ علی میرے جانشین ہی خدا کا حکم تھا لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ اگر بیان کر دیں تو ضعیف الایمان افراد کا گروہ جو ہمیشہ رہا ہے ہے کہنے لگے گا دیکھو پیغمبر اپنے لیے عظمت اور امتیاز پیدا کرنا چاہتے ہیں آیت آیت الیوم اکملت لکم دینکم میں ہم نے دیکھا کہ اس سے قبل کی آیت **الیوم یئس**

الذین کفرو من دینکم فلاتخشوھم واخشون تھی۔جس میں قرآن فرماتا ہے کی اب کافروں کی امیدیں تمہارے دین سے منقطع ہو چکی ہیں مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اسلام کے خلاف اب تک جو جد و جہد کر رہے تھے تھے کی اس پر کامیاب ہو جائیں ان کی امیدیں اب ٹوٹ چکی ہیں اور وہ مایوس ہو چکے ہیں گئے ہیں ان کے بگاڑے کچھ بگاڑ نہیں سکتا لہذا اب کی جانب سے کسی طرح کا خوف و خطر نہ رکھو واخشون لیکن مجھ سے ڈرتے رہو یہ عرض کر چکا ہوں کی اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے بہتر ہوں اگر تم خود اندرونی طور پر خرابیاں پیدا ہوئیں تو میں اپنی اور قانون کے مطابق یعنی جب بھی کوئی باوفا اور برائی کو اپنی راہ بدل دیتی ہے میں بھی اپنی نعمت ان سے سلب کرلیتا ہوں۔ نعمت اسلام کو تم سے سلب کرلوں گا، یہاں واخشون کنایہ ہے۔ مجھ سے ڈرو کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ سے کرو یعنی اب خطرہ اسلامی معاشرے کے اندر سے ہے باہر سے کوئی خطرہ نہیں رہ گیا ہے دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ آیت سورہ مائدہ کی ہے اور سورہ مائدہ نمبر اکرم پر نازل ہونے والا آخری صورت ہے یعنی یہ آیت پیغمبر اسلام کی رحلت کے وقت دو تین ماہ پہلے نازل ہونے والی آیتوں میں سے ہے جب اسلام طاقت اور اقتدار کے اعتبار سے وسعت پا چکا تھا۔

جو آیت ہماری بحث کا محور ہے اور جسے میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اس میں بھی یہی بات نظر آتی ہے کہ خطرہ داخلی طور پر ہے خارجی طور پر کسی طرح کا خطرہ باقی نہیں رہا ارشاد ہیں یا ایھا الرسول ---

ہمیں قرآن میں اس آیت کے علاوہ کوئی اور آیت نظر نہیں آتی جو پیغمبر اکرم کو کسی عمل کی انجام دہی کے لیے آمادہ کرے اور شوق دلائے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ کسی کو کسی کام کے لئے تشویق کیجئے اور وہ اس کے لئے ایک قدم آگے بڑھے پھر ایک قدم پیچھے ہٹ جائے جیسے وہ خطرے یا تذبذب کا شکار ہے۔ یہ آیت بھی پیغمبر اکرم کو تبلیغ کی دعوت دیتی ہے اور اس کے سلسلے ایک طرف دھمکی دیتی ہے ہے اور دوسری طرف شوق پیدا کراتی اور تسلی دیتی ہے۔ دھمکی یہ ہے کہ اگر اگر اس اندر کی تبلیغ تم نے نہیں کی خدمت بے کار ہے اور تسلی یوں دی جاتی ہے کہ ڈرو نہیں خدا تم کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا و اللہ یعصمک من الناس۔ آیت الیوم یئس الذین کفرو من دینکم فلاتخشوھم، میں فرمایا آپ کافروں سے خوفزدہ نہ ہو در حقیقت

پہلی منزل میں پیغمبر کو کافروں سے نہیں ڈرنا چاہیے لیکن اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر فکر مند تھے مجھے بس ظاہر ہے کہ آنحضرت کا تردد اور فکر مندی مسلمانوں کے اندر پائے جانے والے افراد سے ہے مجھے فی الحال اس سے سروکار نہیں ہیں کہ مسلمانوں میں وہ لوگ جو اس تبلیغ یعنی علی کی جانشینی قبول کرنے پر تیار نہیں تھے باطنی طور پر کافی تھے یا نہیں بہر حال یہ مسئلہ کچھ ایسا تھا کہ وہ لوگ اس کے لئے آمادہ کرنے اور اسے قبول پر تیار نہیں تھے۔

تاریخی مثالیں

اتفاق سے تاریخی واقعات اور اسلامی معاشرے کے مطالعے سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے، چنانچہ عمر نے کہا ہم نے جو علی کو خلافت کے لئے منتخب نہیں کیا وہ حیطۃ علی الاسلام تھا، یعنی ہم نے اسلام کے حق میں احتیاط سے کام لیا کیونکہ لوگ ان کی اطاعت نہیں کرتے اور انہیں خلیفہ نہیں مانتے!! یا ایک دوسری جگہ ابن عباس سے گفتگو کے دوران ان سے کہا قریش کی نگاہ میں یہ عمل صحیح نہیں تھا کہ امامت بھی اسی خاندان میں رہے جس خاندان میں نبوّت تھی مطلب یہ تھا کہ نبوت جب خاندان بنی ہاشم میں ظاہر ہوئی تو اس پر اس خاندان کے لیے امتیاز بن گئی لہذا قریش نے سوچا کہ اگر خلافت بھی اسی خاندان میں ہوگا تو سارے امتیازات بنی ہاشم کو حاصل ہو جائیں گے یہی وجہ تھی کہ یہ مسئلہ خلافت امیر المومنین ناگوار تھا اور وہ اسے درست نہیں سمجھتے تھے تھے ابن عباس نے بھی ان کو بڑے ہی مکمل جواب دیے اور اس سلسلے ہیں قرآن کی وہ آیتیں پیش کی جو ان افکار کا اور خیالات کا مدلل جواب ہیں۔

بہر حال اسلامی معاشرے میں ایک ایسی وضع و کیفیت پائی جاتی تھی جس سے مختلف عبارتوں اور مختلف زبانوں میں بیان کیا گیا ہے ان میں سے ایک صورت اور ایک انداز سے بیان کرتا ہے اور عمر کو دوسری صورت میں بیان کرتے ہیں یا مثال کے طور پر لوگ یہ کہتے تھے کہ چونکہ علی نے اسلامی جنگوں میں عرب کے بہت سے افراد اور سرداروں کو قتل کیا تھا اور اہل عرب فطرت حضرت کینہ جو ہوتے ہیں لہذا مسلمان ہونے کے بعد بھی ان کے دلوں میں میں علی سے متعلق پدر کشی اور برادر کشی کا کینہ موجود تھا لہذا علی خلافت کے لئے مناسب نہیں ہے

بعض اہل سنت بھی اسی پہلو کو بطور عذر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ یہ سچ ہے کہ اس منصب کے لئے علی کی کی افضیلت سب ہر نمایاں اور ظاہر کی لیکن ساتھ ہی یہ پہلو بھی تھا کہ انکے دشمن بہت تھے۔

بنابرین کہیں اس کے حکم سے سرتابی کے لیے ایک طرح تردد کی فضا عہد پیغمبر میں ہی موجود تھی اور شاید قرآن کا ان آیات کو قرائن و دلائل کے ساتھ ذکر کرنے کا راز یہ ہے کہ ہر صاف دل اور بے غرض انسان مطلب کو سمجھ جائے لیکن ساتھ ہی قرآن یہ بھی نہیں چاہتا اس مطلب کو اس طرح بیان کرے کہ اس سے انکار و روگردانی کرنے والوں کا انحراف قرآن اور اسلام سے انحراف و انکار کی شکل میں ظاہر ہو۔ یعنی قرآن یہ چاہتا ہے کہ لوگ بہر حال اس مطلب سے سرتابی کرتے ہیں ان کا یہ انحراف قرآن سے کھلم کھلا انحراف وانکار کی شکل میں ظاہر نہ ہوں بلکہ کم از کم ایک ہلکا سا پردہ پڑا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ آیت تطہیر کو ان آیات کے درمیان میں قرار دیا گیا ہے لیکن ہر سمجھدار عقلمند بند اور متکبر انسان بخوبی سمجھ جاتا ہے یہ ایک دوسری بات ہے اسی طرح قرآن نے آیت اکملت لکم اور آیت یاایہاالرسول و کو بھی اسی انداز میں دوسری آیتوں کے درمیان ذکر کیا۔

آیت انما ولیکم اللہ

اس سلسلے میں بعض ایسی آیات بھی ہیں جو انسان کو سوچنے اور غور کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں یہاں ضرور کوئی خاص بات ذکر کی گئی ہے اور بعد میں میں متواتر احادیث حدیث وروایات سے سے بات ثابت ہو جاتی ہے ہیں مثال کے طور پر آیت انما ولیکم اللہ

عجیب تعبیر ہے۔۔۔ ملاحظہ فرمائیں: تمہارا ولی خدا ہے اور ان کا رسول اور وہ صاحبان ایمان جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوۃ ادا کرتے ہیں۔ حالت رکوع میں میں زکوۃ دینا کوئی معمولی عمل نہیں ہے ہے ایک کھلی کے طور پر ذکر کیا جائے جائے بلکہ یہ مفہوم و مطلب جب کسی خاص اس واقعے کی طرف اشارہ کر رہا ہے یہاں اس کی تصریح نہیں کی گئی ہے کہ اس سے سرتابی دوست و دشمن کے نزدیک براہ راست قرآن سے

رو گردانی ی شمار کی جائے گی۔ لیکن فصاحت کے ساتھ ساتھ اس انداز سے سے بیان بھی کر دیا گیا ہے ہے ہر صاف دل دل اور اور منصف مزاج سمجھ جائیں خاص ان کی گئ ہے اور کسی اہم ہم قضیہ کی طرف طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔

الذین یوتون الزکاہ و هم راکعون، وہ لوگ لوگ لیتے رکو میں زکات دیتے ہیں ہیں یہ کوئی عام بار یار نہیں ہیں ہیں بلکہ کہ ہے ایک غیر معمولی واقعہ ہے جو وجود میں آگیا یہ کون سا واقعہ تھا ہم دیکھتے ہیں ہیں کہ بلا استثناء تمام شیعہ و سنی روایات کہتی ہیں کہ یہ آیات حضرت علی ابن ابی طالب سب کے بارے میں میں نازل ہوئی ہے۔

عرفاء کی باتیں

دوسری آیت میں بھی ہیں جن پر گہرائی کے ساتھ غور و فکر سے مطلب واضح تھے اور حقیقت روشن ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ عرفا ایک زمانہ میں سے اس سلسلے میں میں اظہار خیال کرتے رہے ہو ہیں دراصل شیعی نقطہ نظر ہے لیکن عرفا نے سے بڑے حسین انداز میں بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ کی امامت و ولایت آیت کا مسئلہ باطن شریعت سے تعلق رکھتا ہے یعنی وہی اس تک رسائی حاصل کر سکتا ہے جو کسی حد تک ک شریعت اور اسلام کی کی گہرائیوں سے آشنا ہوں ہو یعنی اس نے نے پوسٹ اور چھلکے سے گزر کر اس کے مغز و جوہر تک رسائی حاصل کر لی ہو اور اور بنیادی طور پر اسلام میں امامت و ولایت کا مسئلہ لبی اور اصلی رہا ہے یعنی بہت مدبرانہ نہ فکر آمین میں رکھنے والے والے افراد ہیں اسے سے درد اور سمجھ جھ سے سکتے ہیں۔ دوسروں کو بھی اس گہرائی تک ک کے ساتھ غور و فکر کی دعوت دی گئ ہے۔ یہ اور بات ہے کچھ لوگ اس مفہوم تک پہنچتے ہیں اور کچھ کچھ نہیں پہنچ پاتے۔

اب ہم اس سے متعلق بعض دیگر آیات پر پر توجہ دیتے ہیں ہمارا مقصود یہ ہے کہ شیعہ جو دلائل پیش کرتے ہیں ہیں ہم ان سے آگاہ ہو ہوں اور ان کی منطق کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

امامت شیعوں کے یہاں نبوت سے ملتا جلتا مفہوم

قرآن میں ایک آیت سے جوان ہی مذکورہ آیات کے سلسلے کا ایک حصہ بھی ہے اور بظاہر عجیب آیت ہے۔ البتہ یہ خود امیر المومنین کی ذات سے متعلق نہیں ہے ہے بلکہ مسئلہ امامت سے متعلق ہے ان ہی معنی میں ہے جسے ذکر کر چکے ہیں اور یہاں اشارتا دوبارہ ذکر کرتے ہیں۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ عہد قدیم سے اسلامی متکلمین کے درمیان ایک بہت بڑا اشتباہ موجود رہا ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے اس مسئلہ کو اس انداز میں اٹھایا ہے کہ: امامت کے شرائط کیا ہیں؟ انہوں نے مسئلہ کو یوں فرض کیا کہ امامت کو ہم بھی قبول کرتے ہیں اور اہل سنت بھی لیکن اس کے شرائط کے سلسلہ میں ہم دونوں میں اختلاف پایا جاتا ہے؛ ہم کہتے ہیں شرائط امام یہ ہیں کہ وہ معصوم ہو اور منصوص ہو یعنی اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے معین و مقرر کیا گیا ہو۔ اور وہ کہتے ہیں ایسا نہیں ہے جبکہ شیعہ جس امامت کا عقیدہ رکھتے ہیں، اہل سنت سرے سے اس کے معتقد نہیں ہیں اہل سنت امامت کے عنوان سے جس چیز کا عقیدہ رکھتے ہیں وہ امامت کی دنیوی حیثیت ہے جو مجموعی طور سے امامت کا ایک پہلو ہے جیسے نبوت کے سلسلہ میں ہے پیغمبر اکرم کی ایک شان یہ بھی تھی کہ وہ مسلمانوں کے حاکم تھے لیکن نبوت خود حکومت کے مساوی

پیغمبر اکرم کی ایک شان یہ بھی تھی کہ وہ مسلمانوں کے حاکم تھے لیکن نبوت حکومت کے مساوی اور ہم پلہ نہیں ہے نبوت خود ایک ایسی حقیقت اور ایسا منصب ہے جس کے ہزاروں پہلو اور ہزاروں معانی و مطالب ہیں۔ پیغمبر کی شان یہ ہے کہ اس کی موجودگی میں کوئی اور مسلمانوں کا حاکم نہیں ہو سکتا۔ وہ نبی ہونے کے ساتھ مسلمانوں کا حاکم بھی ہے اہل سنت کہتے ہیں کی امامت کا مطلب حکومت ہے اور امام وہی ہے جو مسلمانوں کے درمیان حاکم ہوں ہو یعنی مسلمانوں میں کی ایک فرد جسے حکومت کے لئے انتخاب کیا جائے آئے گویا یہ لوگ امامت کے سلسلے میں میں حکومت کے مفہوم سے آگے نہیں بڑھے۔ لیکن یہی امامت شیعوں کے یہاں ایک ایسا مسئلہ ہے جو بالکل نبوت کے ہیں قائم مقام قدم بقدم ہے کہ بعض درجات سے بالاتر ہے یعنی ی انبیاے اولوالعزم وہی ہیں جو امام

بھی ہیں بہت سے انبیاء امام تھے ہی نہیں۔ انبیاء اولوالعزم اپنے آخری مدارج میں منصب امامت پر سرفراز ہوئے ہیں۔

غرض یہ کہ جب ہم نے اس حقیقت کو مان لیا کہ جب تک پیغمبر موجود ہیں کسی اور کے حاکم کا بننے کا کا سوال ہی نہیں اٹھتا کتا کیوں بشریت سے مافوق کا حامل ہے ہے یوں ہی جب تک امام موجود ہے ہے حکومت کے لئے کسی اور کی بات نہیں ہوتی جب وہ نہ ہو چاہے یہ کہیں بالکل سے موجود ہی نہیں ہے ہیں یا ہمارے زمانے کی طرح نگاہوں سے غائب ہے اس وقت حکومت کا سوال اٹھتا ہے کہ حاکم کون ہے ہے ہمیں مسئلہ امامت کو مسلہ حکومت میں مخلوط نہیں کرنا چاہیے آئے کہ بعد میں یہ کہنے کی ہائے اے دل تو بتا تھک آئے اے نوبت تھکائے آئے کہ اہل سنت کیا کہتے ہیں اور ہم کیا کہتے ہیں یہ مسئلہ ہی دوسرا ہے ہے شیعہ کے یہاں امامت حضرت بل کل نبوّت سے ملتا جلتا کتا ایک مفہوم ہے اور وہ بھی مندرجات سے سے چنانچہ ہم شیعہ امامت کے قائل ہیں اور وہ سرے سے اس کے قائل نہیں ہیں نہیں یہ بات نہیں ہے کہ قائل تو ہیں مگر امام کے لیے لئے کچھ دوسرے شرائط تسلیم کرتے ہیں۔

امامت حضرت ابراہیم کی ذریت میں

یہاں ہم جس آیت کی تلاوت کرنا چاہتے ہیں وہ امامت کے اسی مفہوم کو ظاہر کرتی ہے جسے شیعہ پیش کرتے ہیں شیعہ کہتے ہیں اس آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امامت ایک الگ ہی حقیقت ہے جو نہ صرف پیغمبر اسلام کے بعد بلکہ انبیائے ماسبق لف کے کے زمانے میں بھی موجود رہی ہے ہے اور یہ منظر ہے ابراہیم کے کے میں صبح قیامت ہے وہ آیت یہ ہے

جب خداوند عالم نے چند امور و احکام کے ذریعے ابراہیم کو آزمایا آیا اور وہ ان آزمائشوں میں پورے اترے تو خدا نے فرمایا: میں بلاشبہ تمہیں لوگوں کا امام بناتا ہوں ابراہیم نے کہا: اور میری ذریت سے فرمایا میرا عہد ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔

ابراہیم معرض آزمائش میں

حجاز کی جانب ہجرت کا حکم

خود قرآن حکیم نے جناب ابراہیم کے کے آزمائش سے متعلق بہت سے مطالب کے ذکر کیے ہیں ہیں نمرود اور نمرودیوں کے مقابلے میں ان کی استقامت اور پائداری ک نار نمرودی میں جانے سے نہیں ہچکچائے ان لوگوں نے انہیں آگ میں ڈال بھی دیا اور اس کے بعد بعد پیش آنے والے دوسرے واقعات۔ انہیں آزمائشوں میں خداوند عالم کا عجیب وغریب حکم یہ بھی تھا جسے بجالانا سوائے اس شخص کے جو خدا کے حکم کے سامنے مطلق تعبد و بندگی کا جذبہ رکھتا ہو اور بے چون وچرا سر تسلیم خم کردے کسی اور کے بس کی بات نہیں ہے ایک بوڑھا جس کے کوئی اولاد نہ ہو اور ستر اسی سال کے سن میں پہلی مرتبہ اس کی زوجہ ہاجرہ صاحب اولاد ہوتی ہے اور ایسے میں اسے حکم ملتا ہے کہ شام سے ہجرت کر جاؤ او اور حجاز کے علاقے میں اس مقام پر جہاں اس وقت کعبہ ہے اپنی اس بیوی اور بچے کو چھوڑ دو دو اور خود وہاں سے واپس چلے آؤ او یہ حکم سوائے مطلق طور پر تسلیم ورضا کی منطق کے چونکہ یہ حکم خدا ہے ہے لہٰذا میں اس کی اطاعت کر رہا ہوں ہو جسے ہم نے محسوس کیا تھا کیونکہ آپ پر وحی ہوتی تھی کسی اور منطق سے میل نہیں کھاتا۔

پروردگارا میں نے اپنی ذریت کو اس بے آب وگیاہ وادی میں تیرے محترم گھر کے نزدیک ٹھہرا دیا تاکہ یہ لوگ لوگ نماز ادا کریں۔ البتہ آپ خود وحی الٰہی کے ذریعے یہ جانتے تھے کہ انجام کا کیا ہے لیکن ان سے بخوبی گزر گئے۔

بیٹے کو ذبح کرو

ان سب سے بالاتر بیٹی کو ذبح کرنے کا مرحلہ ہے ہے آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کو کو منہ میں لے کر دو جہاں آج ہم جناب ابراہیم کی اس بے مثال اطاعت و بندگی اور تسلیم ورضا کی یہ آدمی جانوروں کی قربانی کرتے ہیں چونکہ خدا نے حکم دیا ہے لہٰذا انجام دیتے ہیں ہیں یہاں گنجائش نہیں ہے دو تین مرتبہ جب جب آپ پر وحی ہوتی ہے اور آپ کو یقین ہو جاتا ہے کئے وہ یہ پروردگار ہے ہے تو اپنے بیٹے کے سامنے نے یہ بات رکھتے ہیں اور اس سے مشورہ کرتے ہیں ہیں بیٹا بھی بھی بلا کسی حیل وحجت حضرت اور بہانے کے کہتا ہے اے

میرے بزرگوار جو آپ کو حکم دیا گیا ہے اسے بجالائے ہے آپ انشاء اللہ مجھے مجھے صبر کرنے والوں میں آئیں گے گے قرآن کیسا عجیب اور حیرت انگیز منظر پیش کرتا ہے ہے جب یہ دونوں تسلیم ہو گئے گئے یعنی جب انھوں نے ہمارے حکم کے آگے آگے مکمل طور پر اطاعت و بندگی کا کا اظہار کیا اور ابراہیم نے اپنے بیٹے کو کو پیشانی کے بل لٹا یا کیا یعنی اس مرحلے پر پہنچ گئے گئے جہاں انہیں ابراہیم کو بیٹے کے ذبح کرنے میں شک رہا ہاں اور نے اسماعیل کو ذبح ہو جانے میں کوئی شبہ باقی رہا ہاں اب آپ بھی اطمینان کامل کے منزل پر پر اور بیٹا بھی یقین کامل کے ہم نے اور وحی کی کیا ابراہیم خواب کو سچ کر دکھایا آیا یعنی ہمارا مقصد نہیں تھا ہم نے نہیں چاہا کہ اسماعیل کر دیے جائیں بھائی یہ نہیں فرمایا آیا کہ اس حکم کو عملی طور پر پر انجام دینا لازمی نہیں ہے بلکہ فرمایا تم نے دے دیا کیا کام ختم ہو گیا کیا کیونکہ ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ اسماعیل کو ذبح کر دیا جائے جائے بلکہ ہمارا مقصد اسلام کی نمود عید اور تم دونوں باپ بیٹوں کی تسلیم و رضا کا اظہار تھا جو انجام پا گیا۔

قرآن کے مطابق خداوند عالم نے جناب ابراھیم کو عالمِ پیری میں نعمت اولاد سے نوازا۔ قرآن حکایت کرتا ہے کہ جب فرشتوں نے آکر ان کو یہ خبر دی کہ خداوند عالم آپ کو فرزند عطا کرے گا تو ان کی زوجہ نے فرمایا میں بوڑھی عورت صاحب اولاد ہوں گی جبکہ یہ میرا شوہر بھی بوڑھا ہے؟ فرشتوں نے ان سے کہا ہاں کیا آپ کو امر خدا پر تعجب ہے؟ اہل بیت آپ پر خدا کی رحمتیں اور اس کی برکتیں ہیں بنابرین خداوند عالم نے ابراہیم کو بڑھاپے میں اولاد عطا کی یعنی جب تک جوان تھے صاحب اولاد نہیں تھے آپ اس وقت صاحب اولاد ہوئے جب منصب پیغمبری پر فائز ہو چکے تھے کیونکہ جناب ابراہیم کے بارے میں قرآن کے اندر بہت سی آیتیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب ابراہیم کے پیغمبر ہونے کے سالہا سال کے بعد زندگی کے آخری ایام کیا یعنی ستر اسی سال کے سن میں خداوند عالم انہی اولاد سے نوازتا ہے اور آپ اس کے دس بیس سال بعد تک زندہ بھی رہتے ہیں یہاں تک کی جناب اسماعیل و جناب اسحاق بڑے ہو جاتے ہیں اور جناب اسماعیل تو ان کی حیات میں اتنے بڑے ہو جاتے ہیں کہ خانہ کعبہ کی تعمیر میں اپنے پدر بزرگوار کا ہاتھ بٹاتے ہیں آیت واذ ابتلی ابراھیم ربہ۔۔۔

بتاتی ہے ہے کہ خداوند عالم نے جناب ابراہیم کو آزمائش میں مبتلا کیا آپ نے ان آزمائشوں کو پورا کر دکھایا لاہور اور میں میں کھرے اترے اس کے بعد بعد خداوند عالم نے فرمایا کیا تمہیں لوگوں کا کا امام قرار دیتا ہوں جناب ابراہیم نے دریافت کیا، کیا میری ذریت سے بھی ھی یہ منصب تعلق رکھے گا؟ جواب ملا میرا عہد ان میں سے سے ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔ یہ آیتیں کس زمانے سے سے تعلق رکھتی ہیں؟ کیا جناب ابراہیم کے اوائل زندگی سے؟ مسلم طور پر پر نبوت سے پہلے کی نہیں ہیں کیونکہ کہ ان آیتوں میں وے حی کی بات کہی گئی ہے بہر حال دوران نبوت سے تعلق رکھتی ہے۔ کیا یہ زمانہ نبوت کا ابتدائی زمانہ ہے؟ نہیں بلکہ نبوت کا کا آخری زمانہ ہے اس کی دو دلیلیں ہیں کہ یہ منصب آزمائشوں کے بعد ملا اور جناب ابراہیم کی تمام آزمائشیں آپ کی نبوت کے کے پورے دور میں میں پھیلی ہوئی ہیں اور ان میں سے سے اہم ترین آزمائش آپ کے اواخر عمر سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری یہ کہ اس آیت میں آپ کی ذریت اور اولاد کے تذکرہ بھی ہے جیسا کہ ابراہیم نے خود فرمایا و من ذریتی جس سے معلوم ہوتا ہے ہے کہ آپ صاحب اولاد تھے۔

یہ آیت جناب ابراہیم سے سے جو نبی بھی تھے اور رسول بھی بھی آخر میں میں یہ کہتی ہے ہم تمہیں ہیں ایک نیا عہدہ اور ایک دوسرا منصب دینا چاہتے ہیں ان ء جاعلك للناس اماما میں تمہیں لوگوں کا امام بنانا چاہتا ہوں معلوم یہ ہوا کہ ابراہیم پیغمبر تھے رسول تھے تے لیکن ابھی ایک مرحلہ اور تھا ابھی تک رسائی حاصل نہیں کر پائے تھے اور اور نہیں پہنچے جب تک تمام آزمائشوں سے سے کامیابی کے ساتھ گزر نہیں گئے کیا یہ بات ظاہر نہیں کرتی ان کی منطق میں میں منصب امامت ایک کا نام ہے؟ اب دیکھنا یہ ہے کہ امامت کے معنی کیا ہے؟

امامت، خدا کا عہد

امامت کا مطلب یہ ہے ہے کہ انسان ان اس منزل پر فائز ہو ہو کہ اصطلاحی زبان میں اسے سے انسان کامل کہا جائے آئے کہ انسان کامل ل اپنے پورے وجود کے ساتھ دوسروں کی رہبری وہدایت کا فریضہ انجام دے سکیں کے جناب ابراہیم کو کو فورا اور اپنی ذریت اور اولاد یاد آئی ”و من ذریتی“ خدایا کیا میری ذریت اور میری نسل کو بھی یہ نصیب ہوگا ہے؟ جواب دیا جاتا ہے میرا عہدہ ظالموں تک نہیں پہنچے گا یہاں امامت کو خدا کا کہا گیا ہے یہی

وجہ ہے کہ شیعہ کہتے ہیں ہم جس امامت کی بات کرتے ہیں ہیں وہ خدا کا عہد ہے اس کی جانب سے ہے چنانچہ قرآن بھی یہی فرماتا ہے عہدی یعنی میرا عہد نہ کہ عوام کا عہد جب ہم یہ سمجھ لیں گے کہ امامت کا مسئلہ اللہ ان حکو مت کے مسئلے سے جدا ہے تو اس پر تعجب نہ ہوگا کہ یہ عہد یعنی امامت دخدا سے متعلق کیوں ہیں سوال یہ اٹھتا ہے کہ حکومت و حاکمیت خدا سے متعلق ہے یا انسان سے ؟جواب یہ ہے کہ ہم جس حکومت کی بات کرتے ہیں امامت سے الگ ایک چیز ہے امامت عہد ہے اور میرا عہد تمہاری ظالم اولاد و ستمگر اولاد کو نہیں پہنچے گا جناب ابراھیم کے سوال کا کلی طور پر انکار نہ کیا اور نہ کلی طور سے اقرار فرمایا، جب قرآن نے جناب ابراہیم کی اولاد کو کو دو حصوں میں تقسیم کرکے ظالم اور ستمگر افراد کو الگ کر دیا یا تو ان میں وہ افراد رہ جاتے ہیں جو ظالم و ستم گر نہیں ہیں اور اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب ابراہیم کی نسل میں اجمالی طور پر امامت پائی جاتی ہے۔

دوسری آیت

اس سلسلے میں قرآن کی ایک اور آیت بھی جناب ابراہیم سے متعلق ہے ارشاد ہوتا ہے کہ : وجعلها كلمه باقيه في عقبيه ۔خداوند عالم نے اسے یعنی امامت کو کو ایک باقی اور قائم رہنے والی حقیقت کی صورت میں میں ابراہیم کی نسل میں باقی رکھا۔

ظالم سے کیا مراد ہے؟

یہاں ظالمین کا مسئلہ پیش آتا ہے ائمہ علیہ السلام نے میں نے ہمیشہ ان سے متعلق اس آیت سے استدلال کیا ہے اس سے مراد کیا ہے قرآن کی نگاہ میں ہر وہ شخص کس کو جو اپنی ذات پر اور دوسروں پر ظلم کرے ظالم ہے اور عرف عام میں ہمیشہ ہم ظالم اسے کہتے ہیں جو دوسروں پر ظلم کرے یعنی جو لوگوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالے ہم سے ظالم کہتے ہیں لیکن قرآن کی نظر میں ظالم عمومیت رکھتا ہے چاہے وہ دوسروں کے ساتھ ظلم کرے یا خود پر کرے

جو شخص دوسروں پر ظلم کرتا ہے وہ بھی اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے قرآن میں اپنی ذات یا اپنے نفس پر ظلم کرنے کو بیان کرنے والی بہت سی آیتیں موجود ہیں۔

علامہ طباطبائی اپنے ایک استاد سے نقل کرتے ہیں ہیں کہ حضرت ابراہیم نے اپنی اولاد سے متعلق خداوند عالم سے جو سوال کیا اس سلسلے میں نسل اور ذریت ابراہیم کے نیک اور بد ہونے کی کی تفسیر کچھ اس طرح ہوتی ہے ایک یہ کہ ہم فرض کریں کہ حضرت کی اولاد ہے کچھ ایسے افراد تھے جو ابتدا سے سے آخر عمر تک ہمیشہ ظالم تھے دوسرے یہ کی بعض ایسے افراد تھے جو ابتدائی عمر میں ظالم تھے لیکن آخر عمر میں نیک اور صالح ہو گئے تیسرے کچھ ایسے افراد تھے جو ابتدائی عمر میں میں نیک و صالح تھے اور بعد میں ظالم ہو گئے ہیں اور چوتھے یہ کہ کچھ ایسے بھی تھے جو کبھی ظالم نہ تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جناب ابراہیم منصب امامت کی عظمت وجلالت کو سمجھتے ہوئے اور یہ جانتے ہوئے کہ یہ منصب اتنا اہم ہیں جو نبوت کے بعد آپ کو دیا گیا لہٰذا محال ہے کہ ایسے منصب کی درخواست خداوند والم سے ہے آپ نے اپنی ان اولاد کے لیے کیا ہو جو ابتدا سے آخر عمر تک ظالم اور بدکار تھے یوں ہی یہ بھی محال ہے کہ حضرت ابراہیم کا اپنے ان فرزندوں کے لئے ہو جو ابتداء عمر میں تو نیک تھے لیکن جب انہیں منصب دیا جانے والا ہو تو ظالم ہوں لہٰذا حضرت ابراہیم نے یہ تقاضہ یہ اپنی صالح اور نیک اولاد کے لیے کیا ہے اب ان نے اور صالح افراد کی بھی دو قسمیں ہیں ہیں ایک وہ ایک وہ وہ جو ابتدا سے زندگی کے آخری لمحے تک ہمیشہ نیک رہے اور ایک وہ جو پہلے ظالم اور برے تھے اب نیک اور صالح ہو گئے۔ جب یہ طے ہو گیا کہ حضرت ابراہیم کا تقاضا ان دو طرح کے افراد کے علاوہ کسی اور کے لئے نہیں ہو سکتا تو اب ممکن ہے کہ یہ منصب ان افراد کو نصیب ہو جو اگرچہ اس وقت ظالم و ستمگر نہیں ہیں لیکن ان کی گزشتہ زندگی آلودہ اور ظالمانہ تھی یعنی ان کی زندگی کا پچھلا ریکارڈ اچھا نہیں ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن صاف طور سے سے فرماتا ہے "لاینال عہدی الظالمین" ہے جو لوگ ظلم سے سابقہ رکھتے ہیں اس منصب کے اہل نہیں ہو سکتے۔ ہمارا عہد ظالموں تک نہیں پہنچے گا لہٰذا مسلم طور پر وہ شخص جو اس وقت ظالم ہے یا ہمیشہ ظالم رہا ہے یا پہلے ظالم نہیں تھا ہے لیکن اس وقت ظالم ہے ان میں سے کوئی ایک حضرت

ابراہیم کی درخواست کا مصداق نہیں ہے۔ اس بنا پر قرآن صاف طور پر اس کی نفی کرتا ہے کہ امامت اس شخص تک پہنچے جس کی پچھلی زندگی ظالمانہ رہی ہو۔

یہی وہ چیزیں ہیں جس کی بنیاد پر شیعہ استدلال کرتے ہیں کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ امامت ان لوگوں تک بھی پہنچے جو اپنی زندگی کے کسی دور میں مشرک رہے ہوں۔